52584

حسن و شباب

از

ماہر القادری

شائع کردہ

کتب خانہ تاج آفس

محمد علی روڈ بمبئی

یونیورسل لیتھو پریس [illegible]

ANWAR BHAI KAMAL BARI
BOOK SELLERS
[illegible] Rangili Khidki,
HYDERABAD-500 002

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	دوشیزہ کی آپ بیتی	۵
۲	دھڑکن	۱۷
۳	سوگوار سہاگ	۳۷
۴	بدگمانی	۴۸
۵	ایک رات	۸۱
۶	مردوں کے متعلق ایک عورت کا تجربہ	۹۲
۷	ڈاکخانے کی کھڑکی پر	۱۰۳
۸	خانصاحب	۱۱۳
۹	خانصاحب کا سفر	۱۳۴
۱۰	آنسو اور مسکراہٹ	۱۴۷
۱۱	انگور کے کھیت میں	۱۶۱

جملہ حقوق
بحق پبلشرز محفوظ

دوشیزہ کی آپ بیتی!

مغرب زدہ دنیا اپنے اصلی روپ میں

کلب گھر، کلب گھر —— ہوسناکی کے اڈے، عیش و تفریح کے مسکن، رنگ و بو کے خوفناک ایوان —— یا لوگ وہاں خوشی سے جاتے ہیں کس لئے؟ تہذیب سیکھنے کے لئے، غم غلط کرنے کے واسطے، سوسائٹی میں میل جول حاصل کرنے کی غرض سے —— آہ انسان کے نفس میں کتنی چوریاں چھپی ہوئی ہیں —— انسان... خود غرض انسان نے اس غم غلط کرنے کی آڑ میں کیا کچھ نہیں کیا... انسان اپنی کمزوری کو ہمیشہ لفظی اصطلاحوں کے

پردے میں چھپاتا ہے، دُنیا میں قدم قدم پر الفاظ کے جال بچھے ہوئے ہیں ، اور وہ
"ہم رنگِ زمین" کہ طائرِ جاں کے پھندوں اور زمین کی رنگت میں امتیاز ہی نہ کر سکے۔

اگر دُنیا کی لذتیں ابھی "غم غلط کرنے کے" جذبے سے وابستہ ہیں تو پھر یہ دُنیا
کا ہے کو ہے، افریقہ کا ایک سنسان جنگل ہے جس میں سانپوں کے بل بھی ہیں اور
ریچھوں کی جھاڑیاں بھی، اگر میرا بس چلے تو اس دُنیا کو جسے انسانوں کی بستی کہتے ہیں
جہنم کے اس غار میں اٹھا کر جھونک دوں، جہاں آدمیوں کے جسموں سے ایندھن
کام لیا جاتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ میں دیوانی ہوں، پاگل ہوں، خبط الحواس ہوں
مجھ پر شاید ہسٹریا کا دورہ پڑ رہا ہے۔ اور میرے اعصاب کا تشنج، اور میرے
نظامِ جسمانی کی بے ترتیبی مجھ سے ایسی بے تکی باتیں کہلوا رہی ہے۔ کاش! فردِ
جرم" لگانے سے قبل جرم کی چھان بین کر لی جاتی۔ مگر میں جانتی ہوں کہ دُنیا والے
سچائی کو ہمیشہ جھٹلاتے ہیں اور ان کے احساسات و جذبات کے خلاف جب کوئی آواز
اٹھائی جاتی ہے تو کہنے والے کو جادوگر اور مجنوں بنایا جاتا ہے، میں لوگوں کے کہنے
سننے کی پروا نہیں کرتی۔ سوسائٹی کا قانون میرے ہونٹوں پر، خاموشی کی مہر نہیں
لگا سکتا۔ مجھے خاموش رہنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے وہ کہہ کر
رہوں گی۔ دُنیا والے شوق سے کانوں میں انگلیاں دے کر میری باتوں کا مذاق اڑائیں
میں اپنا کام کئے جاؤں گی۔ دُنیا والے اپنے کانوں کے پردوں سے میری آواز
نہ ٹکرانے دیں گے، تو کیا پھولوں اور ستاروں کو بھی وہ بہرا بنا سکتے ہیں، اور اگر
یکل و انجم کی قوتِ سامعہ کو بھی بیکار بنا دیا جائے تو فطرت جو سماعت اور بصارت

کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس کو تو میری طرف سے غافل نہیں رکھتے۔

میں سنی سنائی باتیں نہیں، آپ بیتی سناؤں گی، ہمدردوں کے سامنے دل کی دھڑکن اور روح کی بے چینی پیش کروں گی۔ کاش! میں اس کوشش میں کامیاب ہو سکوں...... میری باتوں میں ترتیب نہیں ہوتی، جوڑتے اور گھڑتے ہوئے افسانوں میں افسانہ نگار، ترتیب اور تنظیم کا خیال رکھتے ہیں، اس لئے میری باتوں میں اگر آپ کو یہ ترتیب کا افسانوی آرٹ "محسوس" نہ ہو تو آپ ناراض نہ ہوں...... اچھا تو میری باتیں سننے سے قبل اپنے ذہن و خیال کو تمام روایتی شکوک و شبہات سے خالی کر لیجئے، اس بچے کے ذہن و خیال کی طرح، جو سانپ کے پھن اور گلدستہ میں فرق نہیں کرتا۔ اگر آپ سے ہو سکے تو اپنے ذہن و فکر کی اس لوح کو جس پر تجربوں اور روایتوں نے بہت سی پیچیدہ لکیریں کھینچ دی ہیں، تھوڑی دیر کے لئے سادہ بنانے کی کوشش کیجئے۔

اب تک میں آپ کے دماغ سے مخاطب تھی، اب میں آپ کے دل سے خطاب کرتی ہوں، اور وہ اس لئے کہ اب میری "آپ بیتی" شروع ہوتی ہے...... آپ میری کہانی دل کے کانوں سے سن لیں گے۔ تو دماغ کو سوچنے میں دقت نہیں ہوگی۔

میرے والد ایک چھوٹے سے قصبے میں رہتے تھے جس کی آبادی بمشکل پانچ ہزار تھی...... یہ قصبہ ریلوے اسٹیشن سے بہت زیادہ دور تھا، قصبہ کی سڑکیں

تنگ و تاریک اور کچی تھیں، پورے قصبہ میں صرف ہمارا مکان پکی اینٹوں کا بنا ہو
تھا۔ قصبہ کے لوگ ہمارے مکان کو حویلی کہہ کر پکارتے تھے . . . مجھے اس ا
حویلی کے در و دیوار پوری تفصیل کے ساتھ یاد ہیں، اگر حویلی کے تمام حصوں کو بھول
بھی جاؤں تو بالاخانہ کی اس کھڑکی کو تو قیامت تک نہیں بھول سکتی، جس کی پٹ چو
نے میری پیشانی کو لہولہان کر دیا تھا۔ میرے ماتھے پر اب تک چوکھٹ کا نشان
موجود ہے، جس کو لوگ نشانِ سجدہ سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ بچپن کی معصوم شوخی کی ایک
مقدس یادگار ہے۔ اسی حویلی میں میری پرورش ہوئی، میں اور میرا پورا بچپن اس
فضا میں ہنستا کھیلتا ہوا، جوانی کی سرحد میں پہنچ گیا۔ . . .

میرے باپ نے مجھے پڑھانے کے لئے ایک معلم مقرر کر دیا تھا، جن کو سب گھر والے
"ملاجی" کہہ کر پکارتے تھے، ملاجی بڑے خوش مزاج اور ہنس مکھ تھے، ان کی پر لطف
باتیں مجھے آج تک یاد ہیں۔ ایسے شفیق اور ہمدرد استاد قسمت ہی سے میسر آتے ہیں
ان کی پتلی قمچی کی مار کو تو میں کبھی بھول نہیں سکتی۔ وہ لچکیلی قمچی جب یاد آتی ہے۔ تو
مجھے اب بھی پسینہ سا آجاتا ہے۔ لیکن میں اس قمچی کو علم و عمل کا انجکشن سمجھتی ہوں
مجھے جو کچھ تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا آتا ہے۔ یہ اسی "قمچی" کی کرامت ہے۔

میری عمر کوئی گیارہ سال کی تھی کہ ملاجی اپنی بیوی کی علالت کی خبر سنکر اپنے
وطن چلے گئے اور وہاں جا کر گھر کے کاروبار میں کچھ ایسے گھرے کہ ان کا آنا نہ ہو سکا
میری تعلیم اسی منزل پر پہنچکر رک گئی۔ والد صاحب ہفتہ میں ایک آدھ مرتبہ پڑھا
دیا کرتے تھے، مگر یہ پڑھنا پڑھانا برائے نام تھا۔ ملاجی کی کوششوں نے مجھ

میں کسی حد تک مطالعہ کی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔ اُن کے جانے کے بعد میں اپنی سمجھ کے مطابق کتابیں منگا کر پڑھا کرتی تھی۔

میرے بڑے بھائی کا ابتدائی تقرر نائب تحصیلداری پر ہوا تھا مگر وہ چند ہی دنوں میں اپنی محنت و دیانت اور قابلیت کے باعث ترقی کر کے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے گرمیوں کی چھٹیوں میں پہلے پہل ڈپٹی کلکٹر بھائی وطن آئے۔ اور چھٹیاں ختم کرنے کے بعد مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ اس وقت میری عمر پندرہ سال کے قریب تھی۔ یہ میری بھرپور جوانی کا زمانہ تھا لیکن میں سچ کہتی ہوں کہ میں جوانی اور بچپن کو ایک ہی سمجھتی تھی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ قدرت انسان کو کس لئے جوان بناتی ہے؟ اور مجھ میں جوانی نے بہت سی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ اُن کے اسباب اور ماحصل کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مجھ میں شرم کا فطری مادہ موجود تھا اور میں کسی غیر آدمی کو دیکھ کر اپنے سینہ کو ساری یا دوپٹہ سے چھپا لیا کرتی تھی مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ میں ایسا کیوں کرتی ہوں۔ ایک بے اختیار احساس مجھے ایسا کرنے پر مجبور کرتا تھا۔

جوانی میں میری صحت بہت اچھی تھی اور میرا شباب شروع ہی سے جاذب نظر تھا۔ میرے گھر والے کہا کرتے تھے کہ "شمیم ہمارے پورے محلے میں سب سے زیادہ حسین ہے۔" میں اپنے متعلق اس سے زیادہ کچھ کہوں گی تو خودستائی کہی جائے گی۔ جوانی، صحت، خوبصورتی یہ تینوں چیزیں مل جائیں تو آپ ہی انصاف سے بتائیے کہ انسان کو کیا کہا جائے گا۔

جوانی سچ پوچھو تو میرے لئے عذابِ جان تھی بچپن میں جس آزادی کے
میں رہتی تھی، اس آزادی میں اب بہت سی چیزیں دخل انداز ہو گئی تھیں، آ
سب سے زیادہ غصہ مجھے اپنے شباب کے اُٹھان پر آتا تھا، جو مجھے دن رات میں بیس
مرتبہ پریشان کرتا اور نہ معلوم کتنی مرتبہ مجھکر "پشیمان" ہونا پڑتا - لوگ کہتے ہیں عمر
جیسے بڑھتی جاتی ہے، عقل و شعور میں ترقی ہوتی جاتی ہے لیکن معاف فرمائیے! شعور
ترقی یافتہ ہوتا ہے، اتنی ہی ذہن و فکر پر پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں بچپن، جسے
ناسمجھی کا زمانہ کہا جاتا ہے، اس زمانہ کی بات، نہ جوانی میں آتی ہے اور نہ بڑھاپے میں
وہ آزادی! سچی آزادی ہوتی ہے، مسرت ہی مسرت، خوشی ہی خوشی، بڑے ہو کر
بھی مسرت ہوتی ہے، مگر بہت سے رنج و غم اور افکار اس مسرت کا دامن تھامے
ہوتے ہیں ... معاف کیجئے، میں نے پھر فلسفیانہ باتیں شروع کر دیں، مگر میں کیا
کروں جو خیال پیدا ہوتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ میں اس کو منظرِ عام پر پیش
کر دوں -

میرے بھائی ایک معزز عہدیدار تھے، اور ان کی ملنساری اور خوش خلقی نے ان کو
ہر دلعزیز بنا دیا تھا - پبلک اور عہدیدار سب اُن سے خوش تھے اپنے ماتحتوں پر
وہ البتہ ذرا سخت تھے - مگر اس سختی کا مطلب صرف یہ تھا کہ اہل کار کام میں سستی نہ کریں
اور ضبط قائم رہے .... میرے بھائی بددیانت اہل کار کے جانی دشمن تھے، وہ
ماتحتوں کی بڑی سے بڑی غلطی معاف کر دیا کرتے تھے - مگر "بددیانتی" ان کی نظر

میں ناقابلِ معافی جرم تھا۔ اُن کی اس سختی اور روش کی وجہ سے دفتر کی بہت کچھ اصلاح ہو گئی تھی۔

میرے بھائی، کلب گھر کے ممبر تھے۔ مجھے جب وہ اپنے ساتھ ضلع پر لے کر گئے ہیں تو ضلع میں شورش ہو رہی تھی۔ بھائی فوراً ہی دورے پر چلے گئے۔ وہ اپنے دوستوں سے کہہ گئے تھے، کہ وہ مجھے کلب گھر لے جایا کریں۔ مگر میں اُن کی عدم موجودگی میں ایک دن کے لئے بھی کلب گھر نہیں گئی، بھائی دورے سے واپسی کے بعد مجھے اپنے ساتھ کلب گھر لے گئے۔ میں نے اس سے پہلے کوئی "کلب گھر" نہیں دیکھا تھا۔ میں کلب گھر میں پہنچی۔ وہاں سب لوگوں نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا۔ بھائی نے میرا سب سے تعارف کرایا۔

میں کلب گھر میں بڑی خاموشی کے ساتھ بیٹھی رہی، نہ جانے کیوں وہاں کی صحبت سے آپ ہی آپ میرا جی اُلجھتا تھا۔ اور نرم و گداز "صوفہ" مجھے کانٹوں کا بستر معلوم ہوتا تھا، اگر میرا بس چلتا تو میں وہاں سے اسی وقت اُٹھ کر چلی آتی۔ مگر میں بھائی کی پابند تھی، بھائی بہت دنوں کے بعد کلب گھر آئے، اسلئے دوستوں نے اُن کو رات کے ایک بجے تک نہ چھوڑا۔ میں نے وقت کاٹنے کے لئے ایک باتصویر انگریزی رسالہ اُٹھا لیا اور اس کی ورق گردانی کرتی رہی۔ اسی رسالہ میں بعض ننگی تصاویر بھی تھیں جن کو میں نے حیرت و ندامت کے ساتھ دیکھا اور جلدی سے ورق اُلٹ دیا۔ کہ کوئی مجھے ننگی تصویر دیکھتے ہوئے دیکھے گا تو کیا کہے گا؟ دو بجے کے قریب ہم کلب گھر سے رخصت ہو کر گھر آ گئے اور سو گئے۔

دوسرے دن پھر بھائی نے شام کو کلب گھر چلنے کے لئے کہا تو میں نے انکار کر دیا۔ اس پر وہ بولے کہ تم کلب گھر جانا نہیں چاہتیں، تعجب ہے، وہاں تو لوگ ذوق شوق سے جاتے ہیں۔ دل کے بہلانے اور غم غلط کرنے کے لئے کلب گھر سے بہتر کوئی جگہ مل ہی نہیں سکتی۔ دوست، احباب سے بات چیت ہوتی ہے، کھیل کود میں دل لگا رہتا ہے، ادبی اور سیاسی تذکرے رہتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کلب گھر کا جانے والا سوسائٹی کی زندگی سے واقف ہو جاتا ہے اور اس زمانہ میں جو شخص سوشل لائف سے واقف نہیں، وہ جانور ہے جانور۔ بھائی کے اصرار نے مجھے مجبور کر دیا اور میں با دلِ ناخواستہ ان کے ساتھ کلب گھر چلی گئی۔

اس دن سے میرا کلب گھر برابر آنا جانا ہونے لگا۔ میں اب وہاں کے کھیلوں میں بھی حصہ لینے لگی اور میرے احساسات و جذبات میں پہلی سی بے لطفی باقی نہیں رہی تھی۔ اب میں برج کھیلتی تو میرے ساتھی مرد و عورت خوب مزے مزے کی باتیں کرتے جن کا بہت حصہ حسن و عشق، ہنسی خوشی اور ایسی ہی کیفیات و واقعات سے لبریز ہوتا تھا۔

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ عورتیں مردوں کے ساتھ خوب بے تکلفی اور بے پروائی کے ساتھ ملتی ہیں۔ پہلے پہل تو عورتوں کی یہ حرکتیں مجھے بُری معلوم ہوئیں لیکن ان کو دیکھتے دیکھتے نفرت کا احساس جاتا رہا اور میں خود ان تمام باتوں کو گوارا کرنے لگی جن سے پہلے میں پرہیز کرتی تھی، بلکہ جنہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔

میں اب کلب گھر میں بلا ناغہ روزانہ آنے لگی۔ کلب گھر سے مجھے اب دلچسپی

پیدا ہو گئی تھی۔ بھائی دورے پر ہوتے اور میں تنہا کلب گھر جایا کرتی۔ ایک دن میں ذرا
سویرے کلب گھر پہنچ گئی۔ بلیرڈ روم کے قریب سے جب میں گزرنے لگی تو میں نے دروازے
کے آئینوں میں سے دیکھا کہ ایک افسر کی لڑکی جس سے میری ابھی حال ہی میں دوستی
ہوئی تھی، ایک نوجوان کے ساتھ بلیرڈ کھیل رہی ہے۔ میں ایک بنچ پر جا کر بیٹھ گئی مگر تنہائی
کے سبب میرا وہاں جی نہ لگا۔ میں نے وہاں سے اٹھ کر بلیرڈ روم کا رخ کیا۔ میں نے
بلیرڈ روم کے دروازے کا پردہ اٹھا کر جو اندر قدم رکھا ہے تو کیا دیکھتی ہوں کہ وہ
دونوں ایک کوچ پر بے تکلفی کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور نوجوان اپنے ہاتھوں
سے لڑکی کی زلفیں سنوار رہا ہے اور کبھی کبھی رخسار اور شانوں پر گدگدی کر دیتا ہے
وہ دونوں اپنی باتوں میں اس درجہ محو تھے کہ میرے آنے کا ان کو احساس تک نہیں ہوا
میں الٹے پاؤں واپس چلی آئی اور میرا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔
مجھے اس لڑکی کے تصور سے نفرت ہو رہی تھی۔ اور میرا ضمیر اس پر لعنت کر رہا تھا۔ تھوڑی
دیر میں لوگوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس لڑکی کا باپ بھی آ گیا۔ اور وہ نوجوان
لڑکی اس کا باپ اور میں، ہم سب ایک جگہ بیٹھ گئے۔

"آج تم بہت تھکی ہوئی معلوم ہوتی ہو..." لڑکی کے باپ نے دریافت کیا۔ لڑکی
کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ وہی نوجوان۔ دخل در معقولات کرتے ہوئے بولا "جی ہاں آج
ہم دونوں چار بجے سے بلیرڈ کھیل رہے ہیں۔ اس کے بعد شانتا نے کہا، کل ہمارے کالج میں
کا امتحان ہوگا۔ آپ ہندوستان کی قدیم تاریخ پر مختصر تبصرہ کر دیجیے میں کل
ایک گھنٹہ تک تاریخ کا کچھ دیکھ رہا تھا۔"

شانتا کے باپ نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ میں دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی اور وہ منظر میری نگاہوں کے سامنے پھر رہا تھا۔

میں اب تک کلب گھر کو صرف "تفریح اور دل بہلاؤ" کا مکان سمجھتی تھی، لیکن آج میرا دل کھٹکا، کہ یہاں تو کچھ اور ہی سامان ہیں! پچھلے عرصہ میں یہاں کے آنے والوں کی بے تکلفی اور ان کی باتوں پر جو میں نے غور کرنا شروع کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں خود نادانی کے سبب گناہوں کا شکار بنی رہی۔ برج کھیلتے وقت نوجوانوں کا میرے بالوں کو چھو لینا میرے حسن کی تعریف کرنا، ہاتھ ملاتے وقت بہت دیر تک میرے ہاتھ کو پکڑے رہنا یہ سب باتیں مل جل کر ایک افسانہ بن گئیں، ایسا افسانہ جس کی ترتیب میں میری ناسمجھی بھی شریک تھی... آج میں کلب گھر کی ہر بات کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی، میری آنکھوں سے پردے اٹھ چکے تھے۔ اسلئے میں نے آج ہر چیز کو اپنے اصلی رنگ میں دیکھا۔ مردوں کی عورتوں کے ساتھ باتیں، چھیڑ چھاڑ۔! عورتوں کی مسکراہٹیں، اس انداز کے ساتھ کہ ہمارا دل بھی تمہاری لذتوں میں برابر کا شریک ہے! کلب گھر کے ارکان کی باتوں کو آج میں نے بہت غور کے ساتھ سنا تو میرا ضمیر سچ کہتی ہوں ہلنے لگا۔ دنیا نے غریب اور پریشان حال آدمیوں کا نام "بازاری" رکھدیا ہے، بازاروں میں جو کچھ ہوتا ہے، کلب گھروں کی مہذب، متمدن اور روشن خیال دنیا وہ سب کچھ کرتی ہے، بلکہ اس سے کچھ زیادہ۔!

کلب گھر میں ایک ادھیڑ عمر کا شخص، جو انکم ٹیکس کے محکمہ میں ملازم تھا، مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ آج جو مجھے دل لگی سوجھی تو میں نے اس کے ساتھ خوب

کھل مل کر باتیں کیں۔ میری اس ذرا سی توجہ کو دیکھ کر وہ بے تکلف ہو گیا اور اس نے ایک ہی سانس میں اپنی محبت کی کہانی سنا ڈالی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ کلب گھر میں اس کے سوا میرا کوئی سچا چاہنے والا نہیں ہے باقی لوگ تو ہوس کے بندے اور خوشامدی ہیں۔ آج اس عورت پر ریجھ گئے، کل دوسری لڑکی سے بے تکلف ہو گئے۔ میں دل ہی دل میں ہنس رہی تھی کہ مرد عورت کو کس کس طرح سے دھوکا دیتا ہے اور اس کا پہلا حربہ یہی "محبت و خلوص کا اظہار" ہوتا ہے۔ کلب گھر کی زندگی کا میرے لئے یہ آخری دن تھا۔ اسلئے میں نے چاہا کہ اس زندگی کا اختتام ایسی تکلف واقعہ ہی پر ہو... میں اس آدمی کے ساتھ اس قدر توجہ کے ساتھ باتیں کرنے لگی، جیسے سچ مچ میں اس سے دلچسپی رکھتی ہوں۔

اس شخص نے جب دیکھا کہ میں اس کی طرف مائل ہوں تو اس نے کہا کہ یہاں کلب گھر میں بے تکلفی کے ساتھ بات چیت نہیں ہو سکتی۔ چلو رام باغ چلیں، وہاں سیر کریں گے اس وقت بارہ بجے ہیں وہاں بالکل سناٹا ہو گا، سبزہ اور چاندنی رات، ایسے منظر قسمت والوں ہی کو میسر آسکتے ہیں۔ میں فوراً راضی ہو گئی۔ میں آج موٹر خود ہی چلا کر لائی تھی، کتا میرے ساتھ تھا۔ جب میں نے موٹر کا دروازہ کھولا تو وہ میرا عاشق زار میرے قریب بیٹھنے لگا۔ میں نے اس سے کہا کہ تم پیچھے کی سیٹ پر بیٹھو اور میرے کتے کو دیکھتے رہو۔ وہ تو عشق کے نشے میں چور تھا۔ میرے کہنے پر وہ میرے کتے کو پکڑ کر پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ رام باغ میں پہنچ کر میں نے موٹر روک دی اور اس سے کہا کہ آپ اسی روش پر ٹہلتے رہیں میں ذرا باغ کا چکر لگا کر آتی ہوں۔ وہ اتر پڑا

اور میں موٹر لے کر اپنے گھر چلی آئی ... میں نے کتے کو موٹر سے اتارا تو وہ دم ہلانے لگا۔ میں نے اسکی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر کہا "کیا تو بھی کلب گھر کے مردوں کی طرح مجھ سے محبت کرتا ہے۔؟"

کتے نے اپنے مخصوص انداز میں "بخ بخ" کیا اور میں سونے کے کمرے میں چلی گئی۔

دھڑکن

بچپن میں مجھے اس قدر خطرناک بیماریوں سے گزرنا پڑا کہ اُن کے تصور سے آج بھی مجھے پسینہ آجاتا ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میری بوڑھی ماں مجھے کاندھے سے لگا کر گھنٹوں سوچ میں بیٹھتیں۔ اور میرے والدین رات میں سینکڑوں دفعہ میری نبض ٹٹولتے۔ تیرہ برس کی عمر تک بیماری کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ سب لوگ میری زیست سے ناامید ہو گئے تھے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ خدا تنکے میں جان ڈال دیتا ہے۔ بس یہی معاملہ میرے ساتھ ہوا۔ ایک عطائی حکیم کی معمولی سی دوا میرے حق میں تریاق بن گئی۔ اور چند دنوں میں میرے تمام امراض دور ہو گئے۔

تیرہ سال تک جو بچہ فراش رہا ہو، اس کی ناتوانی کا کیا عالم ہوگا۔ لیکن

کی نشوونما کا یہی زمانہ ہوتا ہے۔ اسی زمانہ میں مجھ پر بیماریوں کے پے در پے حملے ہوتے رہے۔ ایک طرف تو جسمانی ترقی رُک گئی دُوسری طرف کمزوری کا یہ عالم تھا کہ صحن میں آدھی دُور جانے میں میری سانس پھُول جاتی اور قدم لڑکھڑانے لگتے۔

خدا خدا کر کے بیماریوں سے چھٹکارا ملا ..... میرے والد کا شہر سے دُور ایک باغ تھا، طبیبوں کی رائے سے مجھے اس باغ میں منتقل کر دیا گیا گھر کے دُوسرے آدمی بھی میری خبر گیری کے لئے باغ ہی میں چلے آئے۔

باغ میں جاتے ہی مجھ میں جان پڑ گئی، وہاں کی آب و ہوا اس قدر موافق آئی کہ میری کمزوری توانائی سے بدلنے لگی اور میں اپنے بچھے ہوئے دِل میں ایک خاص قسم کی امنگ محسوس کرنے لگی۔

شہر کے مکان میں میری صحت کا یہ عالم تھا کہ صحن کا ایک آدھ چکر لگانے میں سر چکرا جاتا، باغ میں آکر اس قدر توانائی آگئی کہ ایک ایک روش پر بیسیوں چکر لگاتی اور ذرا بھی تکان محسوس نہ ہوتی۔ بیماری کے زمانہ میں مجھے قبض کا مرض لاحق تھا باغ میں آتے ہی یہ موذی مرض دُور ہو گیا اور اب میری بھوک کا یہ عالم تھا کہ کچے شفتالو، ناشپاتیاں اور ترش انار دسیوں کی تعداد میں ہضم کر جاتی اور میرا کان بھی گرم نہ ہوتا۔

تین سال تک مجھے باغ میں رہنا پڑا، اور اب جو میں شہر میں واپس آئی ہوں تو میں پُوری جوان ہو چکی تھی۔ میرا رنگ گلاب کی پتی کی مانند تھا، رخسارے

ابھرے ہوئے تھے اور دوپٹہ سے آثار شباب کو چھپاتے چھپاتے تھکی جاتی تھی۔ شہر میں آنے کے بعد اماں جان نے میری صحتیابی کی خوشی میں شاندار پیمانہ پر دعوت کا انتظام کیا۔ ہمارا مکان بڑے قرینہ سے سجایا گیا اور سب لوگوں کے لئے قیمتی جوڑے بنائے گئے۔ میرا جوڑا تمام جوڑوں سے زیادہ قیمتی اور بھڑکیلا تھا کاشانی مخمل کی صدری، اس پر طلا ستارہ کا کام، موتیوں کی جھالریں، اور اس پر مستزاد میرے سینہ کا ابھار۔ آئینہ دیکھ کر میرے ہونٹوں پر ہنسی نمودار ہوتی اور آنکھوں میں حجاب۔

میری سہیلیاں تو آج اس قدر شرارت پر اتر آئی تھیں کہ سارے گھر کو سر پر اٹھا لیا تھا۔ مجھے تو ان ظالموں نے اتنا چھیڑا کہ میرا کہیں دم آ گیا۔ ہر بار سینہ سے دوپٹہ ڈھلکا دیتیں، کبھی صدری کی گھنڈیاں کھول لیتیں، کبھی گدگدی کرتیں، کبھی رانوں کو سہلاتیں، کبھی کان کی لو کو گدگداتیں، ان کی چھیڑ چھاڑ نے مجھے پسینہ پسینہ کر دیا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد محفل رقص و سرود گرم ہوئی، طوائفوں کا ناچ گانا، سننے اور دیکھنے کا میرا پہلا موقع تھا۔ دیوانخانہ میں مردوں کی نشست کا انتظام تھا اور دیوان خانہ کے مشرقی دالان میں عورتیں بٹھائی گئی تھیں۔ دالان کے دروازے میں ہلکی ہلکی چلمنیں ڈال دی گئی تھیں جن میں سے دیوان خانے کے بیٹھنے والوں کی ایک ایک جنبش صاف نظر آتی تھی۔

پہلے دو طوائفوں نے مل کر بہار کہاروں کا ترانہ گایا۔ یہ دونوں طوائفیں

ادھیڑ عمر کی تھیں، ایک کا تو ناک نقشہ بھی اچھا نہ تھا۔ البتہ دوسری ذرا نکیلی تھی شہر کی یہ سب سے اچھی گانے والی طوائفیں تھیں۔ اُن کی آواز بارعب دار تھی اور تلفظ بہت صحیح۔ تین چار چیزیں گانے کے بعد اُن کو محفل سے اُٹھ جانا پڑا۔ بات یہ ہوئی کہ محفل کے نوجوان تماشائی اُن کے گانے سے بڑے بددل ہو رہے تھے۔ اور ادھیڑ اور بوڑھے تعریف کرتے کرتے دوہرے ہوئے جاتے تھے لیکن نوجوانوں کے چبھتے ہوئے فقروں اور آوازوں نے محفل کی ساری بساط اُلٹ دی اور طوائفوں کو اپنا بستر بوریہ باندھ کر اُٹھ جانا پڑا۔

ان طوائفوں کے جانے کے بعد رقاصہ آئی جس کی عمر پچیس سال کے قریب ہوگی اس کا رنگ گندمی تھا، چہرہ گول، پیشانی چوڑی، ناک ستواں، آنکھیں شربتی اور دانت نہایت ہی چمکیلے! رقاصہ نے بڑے ادب کے ساتھ ماتھے پر حنائی انگلیاں رکھ کر محفل کو سلام کیا اور سلام کرنے کے بعد ناچنا شروع کیا۔ کچھ دیر تک وہ ایڑی اور پنجوں کو زمین سے ٹکرا کر گھنگھروؤں سے نغمہ پیدا کرتی رہی۔ اس کے بعد رقص طاؤس کا منظر پیش کیا۔ اُس کی اُٹھی ہوئی پشواز پر مور کے پروں کا گمان ہوتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سچ مچ مور ناچ رہا ہے۔ تمام محفل پر سناٹا چھایا ہوا تھا اور نگاہیں رقاصہ کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

رقص طاؤسی کے بعد رقاصہ آرام کرنے کے لئے بیٹھ گئی۔ پسینہ کے قطرے اُس کے رخساروں پر موتی کی طرح ڈھلک رہے تھے۔ ہونٹوں پر پان کی سُرخی پسینہ کے سبب پھیل گئی تھی۔ قالین پر بیٹھ کر اُس نے پہلے ہونٹوں کی سُرخی کو ریشمیں رومال

سے درست کیا۔ اس کے بعد پسینہ پونچھا۔

نوجوان تماشائی تو رقاصہ کی شمع حسن کا پروانہ بنے ہوئے تھے۔ اُن کی پلک بھی نہ جھپکتی تھی۔ آنکھوں آنکھوں ہی میں رقاصہ کے شباب کی جھلکوں کو جذب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جتنی دیر تک رقاصہ فرش پر بیٹھی رہی۔ یہ لوگ اس پر فقرے کستے رہے چند فقرے مجھے یاد رہ گئے ہیں۔

"رخسارے نہیں ہیں دہکتے ہوئے انگارے ہیں۔ قسم خدا کی ہونٹ جل جائیں گے"

"پشواز کا رنگ کتنا مناسب ہے، کانوں کے آویزے کس قدر خوشنما ہیں۔ اس پر قیامت حسن کا نکھار! یہ عورت نہیں ہے شراب مجسم ہے۔ ذرا شباب تو دیکھئے چولی کے بند ٹوٹے پڑتے ہیں"

"یار اختر! اس کے کوٹھے پر ایک دن ضرور چلیں گے ہزار پانسو کا خون ہو جائے تو بلا سے، چند لمحوں کے لئے دنیا تو جنت بن جائے گی"

"مسکرا کر فرماتا۔ دل کے ٹکڑے کئے دیتی ہے آہ --- کاش!"

کچھ دیر آرام لینے کے بعد رقاصہ تھوڑی دیر تک ناچتی رہی۔ اُس کے بعد نقال آ گئے۔ نقالوں نے اپنی ہر نقل کی تان غریب رقاصہ پر توڑی۔ رقاصہ کا یہ عالم تھا کہ جھینپ کے مارے پیلی پڑی جاتی تھی۔ نقالوں کی تین چار نقلوں کے بعد محفل برخاست ہو گئی۔ رقاصہ کے ناچ کا مجھ پر بڑا اثر پڑا اور میرا دل اس کی عظمت سے لبریز ہو گیا۔

اس کے بعد جو مجھ پر بپتا پڑی ہے وہ سننے کے قابل ہے! ... اماں

جان کے سینہ میں ہمیشہ درد ہوا کرتا تھا اس تقریب کے کوئی دو تین ماہ بعد ایک رات کو اُن کے سینہ میں درد اُٹھا اُسی وقت طبیبوں کو بلایا گیا۔ درد کی اس قدر شدت تھی کہ اماں جان ماہی بے آب کی طرح تڑپتی تھیں۔ طبیبوں نے اپنی بساط بھر سب کچھ جتن کیے۔ مگر موت کا علاج کون کر سکتا تھا۔ دن نکلتے نکلتے اماں جان آخری ہچکی لے کر موت کی گہری نیند سو گئیں۔

ابا جان پر اس واقعہ کا بیحد اثر ہوا میرا حال تو نہ پوچھیے۔ دیوانوں کی طرح گھبراتی پھرتی تھی۔ اس واقعہ کے چھ ماہ بعد ابا جان پر فالج کا حملہ ہوا اور دو تین دن میں وہ بھی چل بسے، والد کے مرنے کے بعد مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا میری دشمن ہے اور ذرہ ذرہ مجھے گرم نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔

ابا جان کے چچا زاد بھائی میرے سرپرست بنے، وہ اپنے مکان سے ہمارے ہی ہاں اٹھ آئے۔ شروع شروع میں تو انہوں نے بڑے پیار محبت کا برتاؤ کیا مگر آگے چل کر وہ روز بروز سخت ہوتے گئے۔ میرا چچا بڑا سنگدل خود غرض اور ذلیل فطرت انسان تھا اس نے چند دنوں میں ہر چیز پر قبضہ جما لیا اور حکومت کے افسروں سے مل کر سرکاری کاغذوں پر لکھوا دیا کہ میرے والد نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ یہ لکھ جانے کے بعد قانونی طور پر یہی شخص میرے والد کا وارث قرار دیا گیا۔ میں اس کے ہتھکنڈوں سے بالکل بے خبر تھی۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ چچا کے چھوٹے لڑکے واصف نے میرا آئینہ توڑ ڈالا اس پر میں نے اُس کے رخسار پر آہستہ سے طمانچہ مار دیا، واصف نے رونا شروع

کیا۔ چچا نے رونے کا سبب پوچھا۔ میں نے اصل بات بتادی۔ میں ابھی بات ختم بھی نہ کرنے پائی تھی کہ چچا نے میرا ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"انیسہ! تو بہت سر چڑھ گئی ہے۔ یتیم ہو جانے کے بعد بھی تیرا غرور کم نہیں ہوا۔ اگر آئندہ سے ایسی باتیں کیں تو گھر سے باہر نکال دوں گا۔"

چچا کی زبان سے ایسے سخت جملے میں نے پہلی مرتبہ سنے تھے۔ میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ میرا دماغ چکرانے لگا۔ چچا کے جانے کے بعد خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

چچا نے اب کھلے طور پر اپنی مکروہ فطرت کا مظاہرہ شروع کر دیا..... اپنے بچوں کو خوشنما کپڑے پہناتا اور مجھے پیوند لگے کپڑے دیتا ... میری آنکھوں کے سامنے واصف، حامد اور نعیمہ کو پھل دیئے جاتے اور مجھ سے جھوٹے منہ یہ بھی نہ کہا جاتا کہ "انیسہ تو بھی ایک آدھ قاش لے لے۔"

یہاں تک بھی غنیمت تھا، لیکن چچا کا اس پر بھی کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ اب اس نے بات بات پر مجھے مارنا شروع کیا۔ ایک دن تو میرے ظالم چچا نے ماما کی لڑکی کلثوم سے مجھے پٹوایا۔ مجھے اس ذلت کا بیحد احساس ہوا اور اب میرے سامنے دو چیزیں رہ گئی تھیں، "موت" یا چچا کے پنجے سے رہائی۔

موت بہت آسان تھی، رسی کا ایک پھندا اس مشکل کو آسان کر سکتا تھا۔ چچا کے فولادی پنجے سے رہائی موت کے مقابلہ میں آسان تر تھی مگر مشکل یہ پیش آتی تھی کہ یہاں سے جانے کے بعد زندگی آخر کس طرح گذرے گی! تنہائی میں گھنٹوں

اس مسئلہ پر غور کرتی، اس اُلجھن میں کئی دن لگ گئے۔ ایک دن سوچتے، سوچتے رقاصہ کا خیال آیا۔ اس خیال کا ذہن میں آنا تھا کہ میرا چہرہ فرطِ مسرت سے تمتما اٹھا میری شکل و صورت رقاصہ سے بہت اچھی تھی۔ عمر میں بھی اس سے چھوٹی تھی۔ رقاصہ کی کامیاب، دلچسپ اور ہر دلعزیز زندگی کا ایک منظر میں دیکھ چکی تھی، لہٰذا میں اس فیصلہ پر پہنچی کہ چچا کے پنجہ سے رہائی پانے کے بعد میں کامیاب اور مسرور زندگی گذار سکتی ہوں۔

میں نے ماما کے چھوٹے لڑکے سے اس رقاصہ کے مکان کا پتہ پوچھ لیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ رقاصہ مجھے ہاتھوں ہاتھ لے گی۔ اور تھوڑے دن کی تربیت کے بعد میں اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکوں گی۔

ایک دن صبح کو جھٹ پٹے کے وقت میں گھر سے نکل کھڑی ہوئی اور گلیوں میں ہوتی ہوئی تانگوں کے اڈے پر پہنچی، تانگہ والے کو رقاصہ کے مکان کا میں نے پتہ بتایا وہ رقاصہ کا مکان اچھی طرح جانتا تھا۔ میں تانگہ میں بیٹھ گئی۔ تانگہ والے نے گھوڑے کو ہٹکا دیا اور تانگہ روانہ ہو گیا۔ کوئی دو گھنٹہ کے بعد رقاصہ کا مکان آ گیا۔ میں تانگہ سے اُتر کر نیچے کھڑی ہو گئی۔ تانگہ والے نے اشارے سے بتایا کہ رقاصہ اوپر کوٹھے پر رہتی ہے، سامنے کے زینہ سے اوپر جانے کا راستہ ہے۔ تانگہ والا کرایہ لے کر چلا گیا اور میں زینہ پر چڑھنے لگی، دو تین سیڑھیاں چڑھنے کے بعد میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ کوئی غیر محسوس طاقت میرے پیروں کو بوجھل بنائے دیتی تھی۔ کئی منٹ تک میں سیڑھی پر کھڑی ہوئی سوچتی رہی، لیکن کچھ

بھی میں نہ آتا۔ گھر کو واپسی کے یہ معنی تھے کہ پھر اسی ذلت و رسوائی کے گڑھے میں خود کو ڈال دیا جائے۔ شہر میں اور کہیں ٹھکانا نہ تھا۔ لہٰذا آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ رقاصہ کے پاس ہی چلنا چاہیئے۔ میں نے دل مضبوط کر کے زینہ کو طے کیا اور زینہ طے کرنے کے بعد جو قدم بڑھایا تو خود کو رقاصہ کے کمرے میں پایا۔

رقاصہ کو جھک کر میں نے سلام کیا اور اس نے حیرت کے ساتھ میرے سلام کا جواب دیا اور مجھ سے پوچھا تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ میں نے رقاصہ کو ساری بپتا سنا دی۔ میری داستان سنکر رقاصہ کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے مسکرا کر میرے سر پہ ہاتھ پھیرا اور بڑی ہمدردی کے لہجہ میں بولی۔

"تم بالکل غمگین نہ ہو۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھو اور مجھے اپنی بڑی بہن کی طرح سمجھو۔ یقین جانو جہاں تمہارا پسینہ گرے گا، میں اپنا خون بہاؤں گی۔ اللہ نے مجھے سب کچھ دے رکھا ہے، نوکر چاکر، مال، زیور، کپڑے، سواری، عزت، عیش، آرام! میرے یہاں خدا کے فضل سے کسی چیز کا گھاٹا نہیں، میں بڑی سے بڑی نعمت تم پر قربان کر دوں گی۔"

رقاصہ کی اس ہمدردانہ گفتگو نے میری ڈھارس بندھائی۔ اور میرے صدمہ میں بڑی حد تک کمی ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے غسل کیا۔ رقاصہ نے بڑا خوشنما جوڑا مجھے پہننے کے لئے دیا۔ جسے پہنتے ہی سامنے مکان میں۔ میں ایک ایس

نظر آنے لگی۔

رقاصہ کا مکان بڑے قرینہ سے سجا ہوا تھا۔ بڑے کمرے میں قیمتی فانوس جگمگاتے تھے۔ دودھ سے زیادہ سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ دیواروں پر آئینے جڑے ہوئے تھے اور کاغذ کی خوشنما بیلیں دروازوں اور کھڑکیوں پر پھیلی ہوئی تھیں۔ سونے کے تین کمرے تھے، اور تینوں کے تینوں اسبابِ آرائش سے دُلہن بنے ہوئے۔ رقاصہ کے سونے کا کمرہ تو نمائش گاہ تھا۔ مجھے رقاصہ کے کمرے کے بازو کا کمرہ دیا گیا۔ جس میں ایک سجی ہوئی مسہری بچھی ہوئی تھی۔ ایرانی قالین کا فرش تھا اور المارییوں میں گلدان رکھے ہوئے تھے۔

نہا دھو کر میں نے کھانا کھایا اور کھانے کے بعد سو گئی۔ شام کے قریب سو کر اٹھی اور ہاتھ منہ دھو کر بڑے کمرے میں آئی یہاں رقاصہ کے پاس کوئی پچاس سال کی عمر کا ایک مرد بیٹھا ہوا تھا جس کے گال پچکے ہوئے تھے، چھدری داڑھی تھی، سر پر پٹے تھے اور گال میں پان کا بیڑا دبا ہوا تھا۔ میں رقاصہ کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ رقاصہ نے اس شخص کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہا:۔

"ان کو سلام کرو، یہ استاد جی ہیں!"

میں نے استاد جی کو سلام کیا وہ دعا دے کر بولے:۔

"جیتی رہو خدا عمر دراز کرے، گلشنِ حسن و شباب ہرا بھرا رہے!"

استاد جی اور رقاصہ میں جو باتیں ہوئیں، ان سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رقاصہ

استاد جی سے میرے متعلق سب کچھ کہہ چکی ہے۔ استاد جی نے اٹھنے سے پہلے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"کیا صورت پائی ہے۔ سبحان اللہ! خدا لگتی کہتا ہوں، ایسا جوبن تو دیکھا نہ سنا۔ جس کو بہت اپنی جوانی پر ناز ہے اس کے حسن کے سامنے اس کا چراغ گل ہو جائے گا۔ خدا نے چھپر پھاڑ کے دولت دی ہے۔ اس کی بلائیں لے کے قربان اس کی خدائی کے واری۔"

رقاصہ اس پر مسرت کے ساتھ مسکرائی۔ مجھے بھی استاد جی کے جملے اچھے معلوم ہوئے لیکن شرم کے مارے اپنی مسرت کا اظہار نہ کر سکی۔

رقاصہ کا نام پری جان تھا۔ شہر کی چوٹی کی طوائفوں میں اس کا شمار تھا۔ ناچ میں تو یہ سب پر فوقیت رکھتی تھی۔ گانے میں البتہ شہر کی دوسری ڈیرے دار طوائفیں اس سے بڑھی ہوئی تھیں۔ اس کا رقص طاؤس دور دور مشہور تھا اور اسی کمال کے سبب اس کی بہت کچھ شہرت تھی۔ اس کا دستور تھا کہ اپنے گھر پر مغرب کے بعد گاتی ناچتی اور شہر کے شوقین مزاج مجرا سننے کے لئے آتے۔ اس طرح اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی۔ جس دن کہیں باہر جانا ہوتا اس دن مکان کی نشست موقوف رہتی۔

جس دن میں آئی تھی اسی دن مغرب کے بعد سازندوں نے ساز سنبھالے اور پری جان بن ٹھن کر قالین پر بیٹھ گئی۔ بہت دیر تک ساز ملائے گئے، بجائے گئے۔ دو چار آدمیوں کے آنے کے بعد پری جان نے ایک ٹھمری چھیڑی [illegible]

کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ ٹھمری ختم ہونے کے بعد ایک ادھیڑ عمر شخص نے پری جان سے کہا :۔

"یہ تمہارے پیچھے کون بیٹھی ہوئی ہیں۔ ان کو ذرا سامنے تو کرو۔"

پری جان نے مسکرا کر جواب دیا :۔

"یہ میری خالہ کی سب سے چھوٹی لڑکی ہے، ابھی بالکل سیکھڑ ہے، بے حجاب بیٹھتے ہوئے شرماتی ہے۔"

سب لوگوں نے اس پر ایک قہقہہ لگایا، پری جان نے اشارے سے سامنے بیٹھنے کے لئے کہا اور میں پری جان کے پاس آ بیٹھی۔

پری جان نے غزل شروع کی جس کا پہلا شعر یہ تھا :۔

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف! تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

پری جان اس شعر کو گاتی جاتی تھی، اور میری طرف اشارہ کرتی جاتی تھی، مجھے اس کے یہ اشارے عرق ندامت میں غرق کئے دیتے تھے، ایک مرتبہ تو اس حرافہ نے "جوانی جوش پر آئی ہوئی" کہکر میرے سینہ سے دوپٹہ کو ڈھلکا دیا، میں نے جلدی سے دوپٹہ سے سینہ کو چھپایا اور سکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس پر گانا سننے والوں نے قہقہہ لگایا اور اس ادھیڑ عمر کے آدمی نے تو قہقہوں کی گرج سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ گانا ختم ہونے کے بعد سب لوگوں نے پری جان کو روپئے دیئے۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد سازندے اٹھ کر چلے گئے۔ کمرے میں استاد جی، پری جان اور میں ہم تینوں بیٹھے رہ گئے۔ استاد جی نے پری جان سے کہا۔

- نواب صاحب، تمہاری بہن کو بڑی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے

پری جان نے اک اطمینان میں پیک تھوکتے ہوئے جواب دیا۔

- استاد جی! میں سب کچھ دیکھ رہی تھی بس اسے فضا لگ آ جانے تو پھر سینکڑوں نواب ہمارے دروازے پہ سر رگڑیں گے۔ استاد جی بس آپ کی مہربانی درکار ہے۔

استاد جی۔ ٹوپی سنبھال کر بولے۔

میں ہر خدمت کے لئے تیار ہوں۔ تمہاری ترقی سے ہماری ترقی وابستہ ہے۔ کل سے انشاءاللہ تعلیم شروع ہو جائے گی۔ آپ بےفکر رہیے، چند دن میں اسے ایسا کر دوں گا کہ جہاں گائے اور آواز کو قوالی پر سبقت دے۔

ایک مہینے تک مجھے گانا سکھایا جاتا رہا۔ بچپن ہی سے مجھے گانے کا بہت شوق تھا یہاں آکر اس شوق کی تکمیل ہو گئی۔ میرے گلے میں قدرتی طور پر لوچ تھا استاد جی کی تربیت نے اس لوچ کو مرتب کر دیا۔

ایک مہینے تک مجھے بڑی محنت کرنا پڑی۔ شام کو حسب معمول پری جان کے پاس آ کر بیٹھتی اور صرف میری صورت دیکھنے کے لئے بہت سے لوگ آ جاتے اور پری جان پر روپے کی خوب بارش ہوتی ...... نواب صاحب تو شاید میری ہی وجہ سے روز آتے تھے کیونکہ میں نے جب بھی اُن کی طرف دیکھا اُن کو اپنی

طرف متوجہ پایا۔

ایک دن شام سے پہلے ~~پری جان مجھے~~ پری جان مجھے اپنے کمرے میں لے گئی اور مجھ سے کہا کہ تم مجھے خوب غور سے دیکھتی رہی۔ پری جان نے پہلے بالوں کو اچھی طرح سنوارا اور پیشانی پر بالوں کو بیچ دے کر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد سرمہ لگایا۔ سرمہ کی تحریر کو کئی مرتبہ رومال سے درست کیا۔ رخساروں کو تولیہ سے رگڑ رگڑ کر خوب سرخ کیا اس کے بعد جاکٹ پہنی۔ جاکٹ نیچے قمیص تھی، پری جان نے قمیص کو اوپر اکسایا اور اب جو اس نے جاکٹ پہنی ہے تو میرے سینے اور اس کے سینے میں نمایاں فرق معلوم ہوتا تھا۔

ہاں! میں یہ عرض کرنا بھول گئی کہ ماں باپ نے میرا نام "انیسہ" رکھا تھا، پری جان نے استاد کے مشورے سے میرا نام "چھوٹی موتی" رکھا، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ اس نام کی ایک طوائف کوتوال شہر کے گھر میں پڑی ہوئی ہے اس لئے "چھوٹی موتی" کے بجائے میرا نام "صنوبر جان" رکھا گیا۔

ایک ماہ کے بعد میں نے گانا شروع کر دیا۔ میرا گانا شروع کرنا تھا کہ پری جان کی آمدنی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ گانا ختم کرنے کے بعد جب استاد جی سارنگی کو اٹھاتے تو روپیوں اور اشرفیوں کا ڈھیر لگ جاتا۔

میں اوپر عرض کر چکی ہوں کہ نواب صاحب مجھ پر جان و دل سے فدا تھے، یہ نواب صاحب ادھیڑ عمر کے تھے۔ ناک نقشہ واجبی سا تھا مگر تمام جسم پر برص کے داغ تھے۔ جن سے مجھے بے حد نفرت تھی اور نواب صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے

مجھے بُرا معلوم ہوتا تھا۔ نواب صاحب چاہتے تھے کہ میں ساری محفل پر لعنت بھیج کر ان ہی کی طرف دیکھتی رہوں۔ اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے وہ عجیب عجیب اشارے کرتے اور جب اشاروں کا جادو نہ چلتا تو مجھے روپیہ دکھاتے۔ میں روپیہ لینے کے لئے ان کے قریب جاتی۔ اور وہ روپیہ دیتے ہوئے ایک آدھ چبھتا ہوا فقرہ کہہ دیتے۔

اب نواب صاحب نے رات کے بجائے دن میں آنا شروع کیا۔ میں نے ایک دن نواب اور استاد جی کی گفتگو سے تاڑ لیا تھا کہ استاد جی کو نواب صاحب نے ملا لیا ہے۔ اور استاد جی کے ملا لینے کے یہ معنی تھے کہ پری جان کو شیشے میں اتار لیا۔

ایک دن دوپہر کے وقت پری جان۔ نواب اور میں کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، پری جان تھوڑی دیر بعد کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، پری جان تھوڑی دیر بعد کمرے سے اٹھ کر چلی گئی اور اب میں اور نواب کمرے میں رہ گئے۔ نواب نے تنہائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے چھیڑنا شروع کیا۔ پری جان، مجھے چند دن پہلے سمجھا چکی تھی کہ نواب صاحب سے مسکرا کر بات چیت کیا کرو۔ اسلئے نواب صاحب کے چھیڑنے پر مسکرا دی۔ نواب پر میرے مسکرانے کا اتنا اثر ہوا کہ وہ گاؤ تکیے سے سرک کر میرے پاس آ بیٹھا۔ مجھے اپنی آغوش میں لینا چاہا۔ ادھر نواب نے اپنی باہیں اٹھائیں اور ادھر پری جان کھٹ سے کمرے میں آ گئی۔ نواب کی باہیں اٹھی کی اٹھی رہ گئیں۔ پری جان نواب صاحب سے مسکرا کر بولی:-

- نواب صاحب جلدی نہ کیجئے صنوبر آپ ہی کی ہے:-

نواب صاحب پر اس جملہ کا اس قدر گہرا اثر ہوا کہ وہ بوکھلا کر میری طرف دیکھنے لگے مجھے اُن کی بوکھلاہٹ پر ہنسی آگئی اور میری ہنسی نے نواب صاحب کی بوکھلاہٹ میں شتابہ لگادیا۔

تھوڑی سی دیر ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں، پری جان نے میری طرف پاندان بڑھا دیا۔ میں پان بنانے لگی، پری جان نواب صاحب کی طرف غور سے دیکھ کر بولی:۔
"کل سے آپ کی صنوبر نے تو میری جان کھالی ہے، اب بھی مشکل میں جان ہے۔ کیا کروں۔ کیا نہ کروں۔"

نواب نے گھبرا کر پوچھا:۔
"ایسی کونسی مشکل آپڑی ہے ہم بھی تو سنیں۔"

اس پر پری جان، نواب صاحب کا زانو دبا کر بولی:۔
"یہ معمول میں اور صنوبر کپڑے والے سیٹھ کے یہاں گئے تھے۔ وہاں شہر کی دوسری طوائفیں بھی تھیں، سیٹھ کے یہاں جو طوائف ملازم ہے اس کی لڑکی کے ہاتھ میں جڑاؤ کنگن دیکھ کر مجھے کئی دفعہ ٹوکا اور جب سے اب تک کئی بار کنگنوں کا ذکر کر چکی ہے ... میرے پاس آج کو روپیہ ہوتا تو صنوبر کی ضد فوراً پوری کر دیتی:"

نواب صاحب نے ہنس کر جواب دیا:۔
"یہ بھی کوئی ایسی مشکل ہے جو دور نہ ہو سکے، صنوبر کے لئے دس جوڑے کنگن آسکتے ہیں تم کہو تو میں اسی میل کے کنگن بنوادوں، اور خود بنوانا چاہو تو روپیہ دے دوں۔"

پری جان نے میری کلائی میں پڑے ہوئے کنگن کو چھوتے ہوئے کہا:-
"سیٹھ کی طوائف کہتی تھی کہ پارسال یہ کنگن ایک ہزار میں تیار ہوئے تھے۔ اب تو سونے کا بھاؤ بہت چڑھ گیا ہے۔ میرے خیال میں ڈیڑھ ہزار سے کیا کم میں تیار ہوں گے؟"

نواب نے جواب دیا:-

"تم نشاطِ خاطر رکھو، شام کو ڈیڑھ ہزار روپیہ نوکر کے ہاتھ بھیج دوں گا۔"

میں حیران تھی کہ پری جان نے نواب کے سامنے اس قدر سفید جھوٹ بولا... نہ تو میں پرسوں کسی سیٹھ کے یہاں مجرے میں گئی اور نہ کسی طوائف کے کنگنوں کو دیکھ کر میں نے اُن کا ذکر کیا۔ مجھے پری جان کی آج کی گفتگو سے اس کی طرف سے بدگمانی سی ہو گئی اور اس کا تصنع اور جھوٹ مجھے بہت بُرا معلوم ہوا۔ شام کو نواب نے ڈیڑھ ہزار روپیہ بھیج دیئے اور پری جان نے اپنی صندوقچی میں سے کنگن نکال کر میرے ہاتھوں میں ڈال دیئے۔ شب کو نواب صاحب آئے اور کنگنوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

جو لوگ پری جان کے یہاں گانا سننے کے لئے آتے تھے ان کی صورتوں سے مجھے نفرت تھی، مگر ان چہروں سے کبھی کبھی جذبات میں ہلکی سی موج ابھر آئی تھی، نواب صاحب سے تو مجھے کسی قسم کی رغبت نہ تھی، وہ جب تک بیٹھے رہتے، میرا دم گھٹتا اور جذبات افسردگی اور انقباض محسوس کرتے۔

پری جان کے یہاں جو طبلہ بجانے والا تھا اس کے لڑکے شبراتی کو بھی پری جان نے اپنے یہاں رکھ لیا تھا۔ شبراتی بازار سے سودا سلف لایا کرتا اور کبھی کبھی مسالہ (مصالحہ)

پیس دیا کرتا - اس کی عمر کوئی اٹھارہ سال کی ہوگی، سانولا رنگ تھا، ناک نقشہ معمولی، قد میانہ، جسم دہرا . . . شبراتی نے پری جان کی بہت سی غزلیں یاد کر لی تھیں اور مسالہ پیسنے میں ان کو بڑے مزے لے لے کر گایا کرتا تھا -

شبراتی بڑا ہنسوڑ اور باتونی تھا - اور نقال تو اس بلا کا تھا کہ جس کسی کی نقل اتارتا، بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سچ مچ وہی آدمی کھڑا ہوا ہے - مجھے اس کی باتوں میں بڑا مزا آتا وہ بھی مجھ سے مانوس ہو گیا تھا - اور کبھی کبھی دبی زبان سے چھیڑ بھی دیتا - ایک دن میں کمرے میں لیٹی ہوئی تھی - شبراتی کسی کام کے لئے ادھر آ نکلا - مجھے سردی معلوم ہو رہی تھی میں نے شبراتی کو آواز دے کر، دوشالہ اڑھانے کے لئے کہا - شبراتی نے مجھے دوشالہ اڑھا دیا - . . اور اس طرح اڑھایا کہ اس کی یہ حرکت بہت بھلی معلوم ہوئی -

نواب کا آنا جانا بہت بڑھ گیا تھا . . . مجھ سے پری جان نے ایک دن یہ کہا کہ شب برات کو نواب صاحب ہمارے ہی یہاں رہیں گے - میں پری جان کی اس بات کا مطلب اچھی طرح نہ سمجھ سکی، دوسرے دن شبراتی سے میں نے اس کا ذکر کیا وہ بالشتیا گنوں سے بھرا ہوا تھا - اس نے مجھے سب باتیں بتا دیں کہ نواب صاحب کے یہاں رہنے کا کیا مقصد ہے؟ . . . میں اس کی باتیں سنکر گھبرا گئی، اب میرے لئے نواب صاحب کے دستِ تصرف سے بچنے کی واحد صورت "فرار" تھی -

شبراتی سے بے تکلفی ہو گئی تھی، میں نے اس کو راضی کر لیا - اب بس موقع کا انتظار تھا، ایک دن پری جان کو شہر میں کسی ساہوکار کے یہاں شادی میں گانے کے لئے جانا تھا، میں نے صبح ہی سے سر سے رومال باندھ لیا - دوپہر کو کراہنے لگی، پریجان

نے حکیم کے یہاں آدمی دوڑا کر حکیم جی کو بلا لیا، حکیم جی نسخہ لکھ کر چلے گئے۔ شام کو مجھے دوا پلائی گئی۔ دوا پیتے ہی میں اور نڈھال ہو کر پلنگ پر لیٹ گئی۔ میری طبیعت کا یہ رنگ دیکھ کر پری جان مجھے مکان پر چھوڑ گئی۔ اور خیراتی اور کریمن کو میری خبرگیری کے لئے بڑی تاکید کر گئی۔

شب کو ہم نے سویرے ہی کھانا کھا لیا، کریمن کو افیم کی عادت تھی وہ تو افیم کھا کر اتنا غافل ہو گئی، خیراتی نے جلدی سے پری جان کی صندوقچی کھول کر بہت سے روپیہ نکالے اور استاد جی کے پلنگ کی چادر مجھے اوڑھنے کے لئے دی، رات کے گیارہ بجے کے قریب میں اور خیراتی پری جان کے کوٹھے سے اتر کر سامنے کی گلی میں گئے اور وہاں سے بہت سی گلیوں میں گھومتے ہوئے۔ بڑے بازار کے موڑ پر پہنچے مگر وہاں پر سپاہی نے خیراتی کو ٹوکا۔ سپاہی کا ٹوکنا تھا کہ میرے تو ہوش جاتے رہے مگر یہ خیراتی بڑا فتنہ تھا۔ بڑے اطمینان کے ساتھ بولا۔

"سپاہی جی! میں فتح گنج کے مکھیا کا بیٹا ہوں، یہ میری بہن ہے، ہم شادی پور سے مہمانی کھا کر آتے ہیں"

سپاہی اس جواب سے مطمئن ہو گیا۔

تھوڑی دور جا کر تانگہ نظر پڑا۔ خیراتی نے بڑے گاؤں کے لئے اس کو چکا لیا، بڑا گاؤں شہر سے کوئی چھ کوس کے فاصلہ پر تھا۔

راستے میں خیراتی، تانگہ والے سے باتیں کرتا رہا۔ اور کبھی کبھی مجھے بھی چھیڑ دیتا، مجھے بڑا لطف آ رہا تھا۔ مگر خوف اور تاریکی نے اس لطف پر بدمزگی کے

موٹے موٹے غلاف ڈال دیئے۔

بڑے گاؤں پہنچکر، پہلے تھانہ آیا اور تھانہ سے تھوڑی دُور جاکر سرائے کا دروازہ آگیا جہاں تانگہ رُکا اور ہم دونوں سرائے میں داخل ہو گئے۔ شبراتی نے بھٹیارے سے ایک کوٹھری کرائے پر لی۔

بھٹیارے نے ایک چارپائی کوٹھری میں ڈال دی اور مٹی کا چراغ جلا دیا۔ کوٹھری کیا تھی اچھی خاصی حوالات تھی۔ مگر پری جاں کے سجے ہوئے کمرے کے مقابلہ میں یہ تنگ و تاریک حجرہ فردوسِ بریں تھا۔

میں پلنگ پر ایک طرف کو بیٹھ گئی اور شبراتی میرا زانو دبا کر گنگنانے لگا۔ اس وقت جو میرے دِل میں "دھڑکن" ہوتی ہے، اس کا لُطف آج تک میرے لوحِ جذبات پر پتھر کی لکیر کی طرح نقش ہے۔ دھڑکن نہ تھی، جوانی کا پیغام اور جذبات کی آواز تھی۔ میرا دِل اب بھی دھڑکتا ہے، مگر اس دھڑکن کا لُطف کہاں آتا ہے ...!

سوگوار سہاگ

کملاپور، ہمالیہ کی ترائی میں چھوٹی سی ریاست تھی جو دریائے برہم پترا کے شفاف آبشاروں اور سگوان کے گھنے جنگل کے سبب بہت زیادہ مشہور تھی۔ موسم کی خوشگواری اور راستوں کی خرابی کے باوجود شوقین سیاح دُور دُور سے آبشاروں کو دیکھنے کے لئے آتے تھے۔ ریاست نے آبشاروں کے قریب ایک چھوٹی سی کارواں سرائے بنا دی تھی۔ جس میں سیاحوں کے لئے ٹھہرنے کا انتظام تھا۔ کارواں سرائے پہاڑ کے دامن میں ایک اُونچے ٹیلے پر واقع تھی۔ اس لیے سے بہتے ہوئے جھرنے صاف دکھائی دیتے تھے۔ اور حدِ نظر تک سگوان کے

تناور درختوں کے جھنڈ نظر آتے تھے۔ ٹیلے کے نیچے چھوٹی سی بستی تھی۔ جو خس پوش جھونپڑیوں کے سبب خانہ بدوشوں کا عارضی کیمپ معلوم ہوتی تھی۔ گاؤں والوں نے سیاحوں کی ضروریات کے لحاظ سے سودے سلف کی دو کانیں رکھ لی تھیں۔ اُن دوکانوں میں کھانے پینے کا سامان۔ بیڑی۔ سگرٹ۔ دیاسلائی۔ لالٹینوں کی چمنی اور ضرورت کی چیزیں ملتی تھیں۔ گاؤں کے بعض لوگ سیاحوں کی ٹہل کر کے کچھ پیدا کر لیتے تھے۔ اس بستی سے تھوڑی دُور پر ایک مندر تھا جہاں بہت سے سادھو اور جوگی رہتے تھے۔ ریاست کی طرف سے اُن سادھوؤں کے کھانے پینے کا انتظام ہوتا تھا۔ مندر کا پجاری ستر سال کا بوڑھا برہمن تھا۔ جس کی پلکیں بھی سفید ہو گئی تھیں۔ اس کے چہرے پر سوچ کے گہرے آثار پائے جاتے تھے۔ اور اس کے ریاضت زدہ تیوروں سے خشونت برستی تھی۔ بڑے بڑے وِدوان پنڈت اس پجاری کی خدمت میں حاضر ہو کر برکت حاصل کرتے تھے۔ کملاپور کا راجہ بھی اس کا معتقد تھا۔ اور مندر کے سالانہ میلہ پر خود راجہ مندر میں آ کر پجاری کے چرنوں کو ہاتھوں سے چھو کر ہاتھوں کو اپنی پیشانی پر ملتا تھا۔

اس مندر کی عمارت تو معمولی تھی۔ مگر محلِ وقوع نے اس کو عجیب بنا دیا تھا، پہاڑ کی خم کھائی ہوئی گھاٹی میں مندر کی عمارت اجنٹا اور ایلورا کے غاروں کی طرح ترشا ہوا پہاڑ معلوم ہوتی تھی۔ پجاریوں اور سادھوؤں کے رہنے کے لئے بہت سی کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں، جن میں بے فکرے پجاری پکا پکایا کھانا کھا کر ڈنڈ پیلتے تھے۔ اس مندر کے متعلق بہت سی کرامتیں مشہور تھیں۔ اور

دور دور سے لوگ مرادیں مانگنے اور چڑھاوا چڑھانے کے لئے یہاں آتے تھے۔ مندر کے دروازے پر ناریل کے ٹکڑے۔ گیندے کے پھول۔ مٹھائیوں کے دونے اور سیندور لگے ہوئے کچے دھاگے پڑے رہتے تھے۔ صبح گجردم مندر میں گھنٹی بجتی اور جٹادھاری سادھو اپنی لمبی جٹاؤں کو لہراتے ہوئے مندر میں پہنچ کر بھجن گاتے اور مندر کا مہنت بوڑھا پجاری گہرے استغراق کے عالم میں کرشن جی کی مورتی کے سامنے سر جھکائے کھڑا رہتا۔ جنگل کے سناٹے میں گھنٹی کا شور اور بھجنوں کے نغمے بڑے بھلے معلوم ہوتے تھے۔ جنگلی پرندوں کے لئے مندر کی گھنٹی بیداری کا پیغام تھی۔ مندر کی گھنٹی اور پرندوں کے پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز میں ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی۔

مندر کے پورب کی سمت کچا چبوترا تھا۔ جس پر پیپل کے دو تناور درخت کھڑے ہوئے تھے۔ کرشن کی مورتی کے ساتھ ان پیڑوں کی بھی پوجا ہوتی تھی۔ درختوں کے تنوں پر سوت کے کچے دھاگے لپٹے رہتے تھے۔ اور درختوں کے سایہ میں صاف ستھری گائیں جگالی کرتی رہتی تھیں۔ مندر میں رہنے والے سادھو ان گایوں کی ٹہل بڑی عقیدت کے ساتھ کرتے تھے۔ چشمے کے صاف پانی سے گایوں کو روز نہلایا جاتا۔ ان کے چرنے کے لئے وسیع سبزہ زار موجود تھا۔ اس مندر کی گائیں بعض انسانوں سے بھی زیادہ خوش قسمت تھیں۔ جاتریوں نے گئو ماتاؤں کو سردی سے بچانے کے لئے دوشالوں اور قیمتی کپڑوں کی جھولیں باندھ دی تھیں۔ سردی کے موسم میں گائیں رنگ برنگ کی جھولوں میں بڑی خوبصورت دکھائی دیتی تھیں۔

اِس ماحول کے پتھر، درخت اور جانور عقیدت کے سہارے زندگی کی انگڑائیاں لے رہے تھے۔

راجہ، مہاراجہ اور امیر آدمی بڑے وہمی ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ امارت کا باطن انتہائی سیاہ اور بھیانک ہوتا ہے اور ان ہی اخلاقی کمزوریوں اور سیاہ کاریوں کے سہارے امارت اور سرمایہ داری کی عمارت کھڑی رہتی ہے۔ اس لئے امیر آدمی معمولی سے خطرہ کو انتہائی خوفناک سمجھتے ہیں۔ اور زوالِ نعمت کا ان کو ہر وقت ڈر لگا رہتا ہے۔ امیروں میں خود اعتمادی کا جذبہ نام کو بھی نہیں ہوتا۔ چوروں کی طرح وہ بزدل اور چالاک ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جوتشیوں، نجومیوں اور کاہنوں کی پیش گوئیوں، پوتھیوں اور زائچوں کی امیر لوگ پناہ ڈھونڈھتے رہتے ہیں۔ کملاپور کے مہاراجہ کو بھی جوتش پر بڑا اعتقاد تھا۔ جوتشی اس کے دربار میں ہر وقت حاضر رہتے اور وہ بات بات میں جوتشیوں سے مشورہ کرتا۔ یہ جوتشی بھی بڑے سادا شناس، نفسیات کے ماہر اور حرفوں کے بنے ہوتے ہیں۔ مستقبل کے متعلق ہمیشہ مبہم بات کہتے ہیں۔ تاکہ اپنی کہی ہوئی بات کی ہر وقت ایک نئی تاویل کی جا سکے۔

مہاراجہ کملاپور کا کلوتے لڑکے کی پیدائش کے وقت جوتشیوں نے زائچہ بنا کر فتویٰ لگایا کہ یوراج کو نظرِ بد کا خطرہ ہے۔ اور یہ خطرہ چودہ سال کی عمر تک رہے گا راجہ کی امیدوں اور تمناؤں کا مرکز یوراج ہی تھا۔ چنانچہ خاص خاص موقعوں کے سوا اسے محل سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ یوراج کی دنیا محل کے

در و دیوار تھے ۔ اسی چہار دیواری میں اس کا بچپن بسر ہوا ۔ یہاں تک کہ اس کی مسیں بھیگنے لگیں ۔

راجہ اور رانی اپنے اکلوتے بیٹے کا جلد سے جلد بیاہ کر دینا چاہتے تھے جوتشیوں کو بلا کر لگن کے لئے شبھ گھڑی دریافت کرائی گئی ۔ یوراج کے لئے لڑکی پہلے ہی دیکھی گئی ۔ قنوج میں ایک جگہ بات ٹھہر گئی اور بہت دھوم دھام سے شادی ہوئی جب دلہن محل میں آئی ہے تو مہارانی نے چاندی کی تھال میں اشرفیاں بھر کر دلہن کے اوپر سے اتاریں اور مٹھی مٹھی بھر کے فقیروں میں بانٹ دیں ۔ یوراج ابھی پورے طور پر جوان نہیں ہوا تھا ۔ لیکن وہ بہرحال دولہا بن چکا تھا ۔ دلہن گھر میں آ چکی تھی ۔ اور اسے دنیا کی ایک رسم کی پابندی کرنی تھی ۔ یوراج دلہن کو محل میں لا کر خوش تھا اور اس کی تنہائیاں جلوت سے بدل چکی تھیں ۔ مگر جوانی نے ابھی جذبات کی انگیٹھی کو پورے طور پر گرمایا نہیں تھا ۔ اس لئے دونوں طرف سے مسکراہٹ کا جواب صرف مسکراہٹ سے دیا جاتا تھا ۔ جذبات پیدا تو ہو چکے تھے مگر ابھی ان میں آنچ کی کسر تھی ۔

جس مندر کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے ، اس کی سالانہ جاترا کے موقع پر جوتشیوں نے مہاراج سے کہا کہ یوراج کو مندر میں جا کر کرشن کی مورتی کے چرن چھو لے چاہئیں اور مندر ہی میں اس کا کلیان ہونا چاہئے ۔ راجہ نے حکم دیا کہ جاترا میں جانے کی تیاری کی جائے ۔ کارواں سرائے میں راجہ اور اس کے ساتھیوں کے ٹھہرنے کا انتظام ہوا ۔ ڈیرے خیمے لگ گئے ۔ جاترا سے ایک دن پہلے

راجہ حشم و خدم کے ساتھ مندر میں پہنچا۔ مذہبی رسمیں ادا کی گئیں۔ یوراج نے کرشن مورتی کے چرنوں کو چھوا۔ بوڑھے پجاری نے یوراج کو آشیرواد دیتے ہوئے ماتھے پر چندن کا ٹیکہ لگایا اور یوراج کی گود باتاشوں سے بھر دی، مندر میں گھنٹہ بجنے لگا۔ خوشی اور مبارکباد کا گھنٹہ! مندر کے صحن میں چاندی کی ترازو نصب تھی، ترازو کے ایک پلڑے میں یوراج بیٹھا اور دوسرے پلڑے میں سونا چاندی اور اناج رکھا گیا، یوراج ادھر ترازو کے پلڑے سے اترا اور ادھر سادھو لوگ سونے چاندی اور اناج پر ٹوٹ پڑے۔

جاترا سے فارغ ہو کر راجہ رانی، یوراج اور اس کی دلہن کارواں سرائے میں جا کر ٹھہر گئے۔ یوراج کو ساری عمر میں پہلا موقع گھومنے پھرنے کا تھا۔ وہ سبزہ زار میں دوڑتا، پیڑوں سے پھول چنتا، آبشاروں کے پانی سے کھیلتا درختوں کی شاخوں پر جھولتا، وہ بہت خوش تھا، اس پرندکی طرح، جو قفس سے تازہ تازہ چھوٹ کر آیا ہو۔ یوراج کی بیوی کنول رانی بھی بہت مگن تھی۔ گاؤں کی لڑکیاں جنگلی پھولوں کی مالائیں بنا کر، اس کے پاس بھیجتیں، اور وہ ہنس کر اور خوش ہو کر مالاؤں کو گلے میں پہنتی، بالوں کے جوڑے میں گوندھتی اور اپنے پلنگ کو سجاتی۔ . . جنگلی پھولوں کی سیج روز روز کس میسر آتی ہے۔

یوراج ایک دن صبح سویرے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اسکی پیشی کے نوکر سو رہے تھے۔ صبح کا سہانا وقت، سبزہ زار۔ پرندوں کے چہچہے، پہاڑ کا دامن، ٹھنڈی ہوا۔ یوراج آبشاروں کی طرف بڑھتا ہی چلا گیا۔ آبشاروں سے کئی راستے

جاتے تھے۔ کاروان سلطنت کی طرف آنے والے راستہ سے وہ واپس ہونا بھول کر دوسرے
راستہ پر پڑ لیا۔ اور جنگل میں ایسا کھو گیا کہ پھر واپس نہ آیا۔ شاہی کیمپ میں کہرام
مچ گیا کہ یوراج کھو گیا۔ راجہ کے نوکروں نے یوراج کی تلاش میں زمین و آسمان ایک
کر دیے۔ مگر اس کا پتہ نہ ملا۔ یوراج کی نوخیز دلہن کنول رانی پر قیامت ٹوٹ گئی۔
اس کا سہاگ وقت سے بہت پہلے اجڑ گیا۔ اس کے سہرے کے پھول باسی ہونے
سے پہلے ہی خشک ہو گئے۔ وہ زخمی ہرنی کی طرح تڑپتی تھی۔ مگر آہ و فریاد سے جو گئی
بات واپس نہیں ہو سکتی تھی۔ راجہ پر اس واقعہ کا اتنا شدید اثر ہوا کہ وہ چند
دن بیمار رہ کر مر گیا۔ اور وفادار رانی نے بھی شوہر کے مرنے کے دو ہفتہ بعد اس
دنیائے آب و گل کو موت کی آخری ہچکی لے کر خیرباد کہہ دیا۔

کملاپور کا وزیر اعظم بڑا ہی نیک نفس اور دھرماتما انسان تھا۔ اس نے راجہ کے
مرنے پر کنول رانی کو گدی پر بٹھا دیا۔ اور خود انتظام کرنے لگا۔ وہ چاہتا تو قسمت
کی نزاکت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر خود ہی تخت و تاج کا مالک بن سکتا تھا لیکن
وہ شرافت کا پتلا اور احسان شناسی کا پیکر تھا۔ اس کا ضمیر اس غداری اور نمک حرامی
کے لئے کسی قیمت پر بھی تیار نہ تھا۔ کنول رانی اب کملاپور کی مہارانی تھی۔ ہر قسم
کا عیش اس کے لئے موجود تھا۔ مگر شوہر کے یکایک گم ہو جانے کا غم گھن کی طرح
اندر ہی اندر کھائے جاتا تھا۔ اس کے ہونٹ بہت کم تبسم آشنا ہوتے تھے۔ ایک
کا اداس چہرہ غم پنہاں کا ترجمان تھا۔

زمانہ بڑا ہی گریز پا واقع ہوا ہے۔ پلک جھپکاتے جگ بیت جاتے ہیں۔

اس واقعہ کو بھی دس سال گذر گئے۔ اور یوراج کے لوٹنے اور ملجانے کی اُمید کسی کو باقی نہیں رہی۔ کوئی کہتا تھا کہ یوراج کو تبت کے خانہ بدوش پکڑ کر لے گئے۔ کسی کا خیال تھا کہ وہ درندے کا لقمہ بن گیا۔ کسی کا کہنا تھا کہ کوئی پری یوراج کو اٹھا کر لے گئی۔ جتنے مُنہ اتنی باتیں۔ ہر شخص اپنے قیاس سے واقعات کی کڑی ملاتا تھا۔

اس واقعہ کے دس گیارہ سال بعد نیپال کی طرف سے جوگیوں کا ایک گروہ مندر کی زیارت کے لئے آیا اور کچھ دنوں تک مندر میں ٹھہرا رہا۔ ان ہی جوگیوں میں بیس بائیس سال کا ایک نوجوان تھا جس کی صورت گمشدہ یوراج سے ملتی تھی۔ لوگوں میں چرچے ہونے لگے۔ نیپال کے جوگیوں کے کان تک جب یہ بات پہنچی تو انہوں نے خوش ہو کر ہامی بھر لی کہ آج سے دس سال پہلے اس لڑکے کو ہم نے جنگل میں گھومتا ہوا پایا تھا۔ جوگیوں کو معلوم ہوا کہ یوراج کے سیدھے ہاتھ کی بیچ کی انگلی کا پورا کٹا ہوا تھا۔ تو ان مکار ظالموں نے اپنے ساتھی جوگی کو سمجھا بجھا کر اس کی انگلی کا پورا بھی دیا۔ رفتہ رفتہ اس واقعہ کی خبر کملا پور ریاست کی راجدھانی میں پہنچی۔ وزیر اعظم خود دوڑا ہوا مندر میں آیا۔ اس نے دیکھا کہ واقعی ایک نوجوان یوگی آج کی صورت کا وہاں موجود ہے اور اس کے سیدھے ہاتھ کی انگلی کا پورا بھی کٹا ہوا ہے۔ تمام ریاست میں شور مچ گیا کہ یوراج جو آج سے دس سال پہلے کھو گئے تھے مل گئے۔ نوجوان جوگی کی صورت یوراج سے بہت زیادہ ملتی جلتی تھی۔ اور تھوڑا بہت فرق تھا بھی تو لوگ سمجھتے تھے کہ دس سال کے عرصہ میں اتنی تبدیلی ہونی چاہیئے۔

راج دھانی میں خبر کر دی گئی کہ مہاراج جی یوراج کو لے کر آ رہے ہیں۔ گھر گھر خوشیاں منائی جانے لگیں۔ کنول رانی کا کیا پوچھنا اس کی امیدوں کا ستارہ جو ڈوب کر طلوع ہوا تھا اس کی ویران آنکھوں میں ایک چمک آ گئی تھی اور اس کے رخسار جو شدت غم سے زرد ہو گئے تھے آج کی آن میں انگارے کی طرح لال ہو گئے۔ سچ کہتے ہیں جب طبیعت بشاش ہوتی ہے تو اپنے ماحول کو بھی خوش رنگ بنا دیتی ہے۔ کنول رانی کی مسرت نے سارے محل کو رشک گلزار بنا دیا تھا۔

بناوٹی یوراج کا راج دھانی میں بڑا پرجوش استقبال کیا گیا۔ راج دھانی کی گلیاں تماشائیوں سے پٹی پڑی تھیں اور اس کے رتھ پر اتنے پھول پھینکے گئے کہ رتھ کے اوپر نیچے پھول ہی پھول نظر آتے تھے۔ جوگی کے بیٹے کو محل میں لے جا کر گدی پر بٹھلایا گیا۔ وزیر اعظم نے اس کے چرنوں کو بوسہ دیا اور عمائد حکومت نے نذریں پیش کیں ابھی رسموں کے پورا ہونے میں رات کا پہلا حصہ صرف ہو گیا۔

کنول رانی کو پھر سے دلہن بنایا گیا۔ کنول آج سچ مچ کنول کا پھول بنی تھی۔ اس کے رخسارے اتنے صبیح اور رنگین تھے کہ عقیق کی طرح ان کی جوت پڑتی تھی۔ اپنے خاص کمرے میں وہ بن سنور کر بیٹھ گئی۔ خوشی کے طوفان میں اس کے دل کا سفینہ ہچکولے کھا رہا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں پر لطف بھی ہوتی ہیں۔ اور تکلیف دہ بھی۔ لطف و اذیت مل جل کر انتظار کو بہت دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ پہرہ داروں نے آواز دی کہ رات دو پہر جا رہے ہیں۔ کنول رانی چھپر کھٹ کے سہارے گھونگھٹ نکال کر کھڑی ہو گئی۔ خلوت خانے کے ایک طاق میں چراغ جل رہے تھے۔ اور ہوا کے ہلکے جھونکے چراغوں کی لو کو جب

تھرتھراتے تھے تو خلوت گاہ میں قدم رکھا - ادھر نوکرانیاں مسکراتی ہوئی وہاں سے چلدیں کنول رانی نے گھونگھٹ کی اوٹ سے یوراج کو دیکھا صورت شکل اس کے گم شدہ شوہر سے ملتی جلتی تھی - مگر اس کی آنکھوں کو پورا الیقین نہ ہوتا تھا اور وہ مسرت جو یوراج کے آنے سے پہلے تھی اسمیں خود بخود کمی اور گرفتگی پیدا ہو گئی تھی -

چھپر کھٹ کے سامنے آبنوس کی چوکی پر تیل کے چراغ جل رہے تھے، یوراج کو محل کی رسم کے مطابق چراغوں کو پھونک سے بجھانا چاہیئے تھا - مگر بناوٹی یوراج ان رسموں سے بے خبر تھا وہ سیدھا کنول رانی کے پاس پہنچا اور اس کی طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اپنے گلے میں پڑی ہوئی سنہری مالائیں اور انگرکھا اتارنے لگا - کنول رانی کا ماتھا ٹھنکا وہ سمٹ سمٹا کر ایک طرف کو کھڑی ہو گئی - اس کا شبہ قوی ہوتا جاتا تھا - بناوٹی یوراج کی ہر ادا اس کے گمشدہ شوہر سے مختلف تھی - یوراج کی عادت تھی کہ جب بھی وہ شب کو خلوتگاہ میں آتا تو اپنے ساتھ پھولوں کی مالا لاتا اور بیوی کے گلے میں پہناتا جوگی کا لڑکا زیور اور لباس اتارنے کے بعد کنول رانی کی طرف بڑھا اور کا ہاتھ تھام لیا - کنول شرم کے مارے پسینہ پسینہ ہوئی جاتی اور وہ محسوس کر رہی تھی کہ کوئی غیر مرد اس کا جسم چھو رہا ہے -

جوگی کے لڑکے کا چہرہ ہوسناک جذبات نے سرخ بنا دیا تھا اس کی آنکھوں میں جذبات کی وحشت جھلک رہی تھی اور وہ جذبات کے اس آخری نقطہ پر تھا جہاں حیوانیت اور انسانیت ایک ہو جاتی ہیں - کنول رانی نے جرأت کی اور اس نے بڑھ کر بناوٹی یوراج کے پیٹ سے کرتہ اٹھا دیا، یوراج کے پیٹ پر ایک گہرا داغ

تھا۔ وہ اسی غرض سے اپنے شوہر کی پہچان اور قلب و نظر کا اطمینان کرنا چاہتی تھی۔ بناوٹی یوراج کے پیٹ پر داغ نہ پاکر اس نے زور سے چیخ ماری اور شور مچانا شروع کیا۔ محل میں کھلبلی مچ گئی۔ نوکرانیاں دوڑی ہوئی خلوت گاہ میں آئیں۔ کنول رانی نے کہا کہ یہ یوراج نہیں ہیں میرے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے۔ وزیر اعظم کو خبر ہوئی۔ واقعہ کی تحقیقات کی گئی۔ فریب کے چہرے سے پردہ اٹھ چکا تھا۔ بناوٹ کی بنیاد بہت ہی کمزور ہوتی ہے۔ ریت کی دیواروں سے زیادہ کمزور۔

ریاست کے قانون کے مطابق بناوٹی یوراج کو خانہ بدوش جنگلیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ مندر میں پہنچ کر جوگیوں کو گرفتار کیا گیا ان کے لیے جیل خانہ کے دروازے پہلے ہی سے کھلے ہوئے تھے۔ اس دن سے ریاست کے جوگیوں اور سادھوؤں پر شدید پابندی عاید کر دی گئی۔ کنول رانی کا سہاگ ذرا دیر کی بہار دیکھ کر پھر اجڑ گیا۔ اور اس کی مسرت پھر غم میں تبدیل ہو گئی۔

بدگمانی

تنویر کو شعر و ادب سے فطری لگاؤ تھا۔ ماحول کے اثرات اور گرد و پیش کے حالات نے اس تعلق کو جلا دے کر معراجِ کمال تک پہنچا دیا یہ صحیح ہے کہ فطرت اپنا راستہ خود نکالتی ہے۔ مگر موانع اور مشکلات کی فراوانی فطرت کی جودت کو مجروح کر دیتی ہے۔ دنیا کی ادبی تاریخ ایسے اکثر افراد کے نام پیش کر سکتی ہے۔ جن کی فطرت، ذہانت و فطانت سے ترکیب دی گئی تھی جن کے قوائے ذہنیہ ہر اعتبار سے مکمل تھے۔ لیکن زبونی واقعات اور خرابی حالات کے ہاتھوں فطرت کے شباب پر قبل از وقت بڑھاپا آ گیا۔ دل و دماغ کی بہار بہت جلد نذرِ خزاں ہو گئی اور یہ

یہ تابناک جوہر گمنامی اور ناقدر شناسی کے غبار میں دب کر رہ گئے۔ تنویر ایک ایسے
گھرانے کا رکن تھا جس میں شعر و ادب کا خاص چرچا رہتا تھا۔ تنویر کے والد ایک کہنہ
مشق شاعر اور اچھے انشا پرداز تھے۔ انکی محفل میں بیٹھکر بھی اس کو ایک اچھا ادبی ماحول مل
گیا۔ غرض وہ تمام مؤثرات و محرکات جو وجدان کو ابھارنے کا باعث ہوتے ہیں تنویر
کو بغیر کسی کوشش کے میسر آگئے۔

تنویر فطرتاً جدت پسند واقع ہوا تھا۔ تقلید و تتبع سے اسے بڑی نفرت تھی۔ قدیم
و فرسودہ خیالات کے اعادہ کو وہ اپنے لئے باعث ننگ و عار سمجھتا تھا۔ اسی جدت
طبع کا اثر تھا کہ تنویر کے مضامین نے ادبی حلقہ میں غیر معمولی قبول حاصل کیا۔ رسائل کے
اڈیٹر اس کے مضامین کے لئے ہر وقت چشم براہ رہتے تھے اور ناظرین کی نگاہیں رسائل
کی فہرست مضامین میں "خاک نشین" کا نام دیکھنے کے لئے اکثر بے قرار رہتی تھیں جو
تنویر کا صحافتی نام اور ادبی عرف تھا۔ تنویر کے دوست احباب اس کو تنویر کی حیثیت
سے جانتے تھے۔ لیکن ملک تنویر سے نہیں "خاک نشین" سے متعارف تھا۔

تنویر نے اپنی منکسر المزاجی کے باعث یہ نام اختیار کیا تھا۔ فی الحقیقت وہ
آسمان صحافت کا درخشندہ تارہ تھا۔ اس کے خیالات میں تنوع اس کے تخیل میں
ابداع اور اس کے اسلوب نگارش میں جدت تھی۔ وہ بیک وقت مؤرخ بھی تھا اور
ابن رشیق بھی سوتن بھی تھا اور بطلیمس بھی۔ علم ہیئت کی طرف متوجہ ہوا تو ناظرین کو
کہکشاں اور ثریا کی سیر کرا کے چھوڑی۔ تاریخ پر قلم اٹھایا تو دنیا کے سامنے اصول
تاریخ کا ایک جدید باب کھول دیا۔ ادبی مضامین کی جانب مائل ہوا تو خیالات کی

بلندی پر ادب کا نیا قصر منٹوں میں کھڑا کر دیا۔ نثر کے علاوہ نظم میں بھی اس کو یدِطولیٰ حاصل تھا۔ طبیعت کی موزونیت کا یہ عالم تھا کہ ابھی فلسفہ کا مضمون لکھ کر ختم کیا اس کے بعد ذرا گنگنایا اور تھوڑی ہی دیر میں کسی دلکش موضوع پر ایک لطیف و جمیل نظم کہہ ڈالی۔ اس کا دماغ فلسفی تھا لیکن اس کا دِل شعریت سے لبریز تھا۔ نثر کی طرح نظم میں بھی اس کو تقلیدؔ و اتباع سے سخت اجتناب تھا۔ ایک دفعہ وہ اپنی ایک نظم جو اس نے بڑی محنت سے کہی تھی حلقہ احباب میں سنا رہا تھا جب نظم سنا چکا تو ایک دوست نے کہا۔ بھائی تنویر! یہ تم نے کیا کیا تم ایک جدت پسند قادر الکلام شاعر ہو میرا خیال نہیں بلکہ ایقان ہے کہ تم دانستہ طور پر کسی دوسرے شاعر کے خیالات کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنا کر دُنیا کے سامنے پیش نہیں کر سکتے۔ تمہارے اور ٹینی سن کے خیالات کا اتفاقی تصادم "توارد" سے زیادہ . . . اور کچھ نہیں ہے۔ اور شاعری کے قانون میں یہ سہو کوئی تعزیری جرم نہیں۔

اس پر تنویر نے برافروختہ ہو کر کہا:۔ توارد۔ توارد خیالات کے چوروں اور تخیل کے لٹیروں نے اپنے بچاؤ کے لئے۔ توارد کی سپر تیار کی ہے۔ اگر زہر کا نام گلقند رکھا جائے تو کیا لفظی تبدیلی سے اسکی ماہیت بھی بدل جائے گی۔ اگر انگاروں کو لوگ پھول کہنے لگیں تو کیا کیف گلفروش اسکی حرارت سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ کوئی کوئی سادہ لوح اگر سانپ کے پھن کو بنفشہ کا پھول کہنے لگے تو کیا آپ اس کو ہاتھ میں لے سکیں گے۔ میرے نزدیک شعر کے دامن پر توارد ایک ایسا بدنما دھبہ ہے۔ جس کے تصور سے شاعر کا دماغ چکرا جانا چاہیئے۔ ٹینی سن ہو یا فردوسی میری

نظروں میں اگرچہ ان کا انتہائی احترام ہے۔ مگر میں ان کی تقلید اپنے لئے باعثِ ننگ سمجھتا ہوں۔ کیونکہ جب کوئی شاعر کسی دوسرے شاعر کی تقلید کرتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اس نے اپنا وجود بالکل فنا کر دیا۔ میں اپنے وجودِ شعری کی فنا کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا"

شکیلہ کے باپ محمد جعفر، ریاست میں محکمہ زراعت کے مہتمم تھے۔ ریاست کشمیر نے آبپاشی کی جدید اسکیم کے سلسلہ میں ان کی خدمات مستعار لی تھیں۔ شکیلہ کے باپ نے بیٹی کو خانگی طور پر بہت معقول تعلیم دلائی تھی۔ جب محمد جعفر کشمیر پہنچے تو شکیلہ کی عمر مشکل سے گیارہ برس کی ہوگی۔ مگر اردو رسائل کے مشکل اور دقیق مضامین سمجھنے میں اس کو زیادہ دشواری پیش نہ آتی تھی۔ محمد جعفر کا معمول تھا کہ وہ بیٹی سے کسی ادبی موضوع پر گفتگو کرتے۔ شکیلہ میں اخذ و قبول کی استعداد پہلے سے موجود تھی۔ اس مشق و ممارست نے اس فطری جوہر کو اور چمکا دیا۔ شکیلہ کو مضمون نگاری کا بہت بچپن ہی سے شوق تھا۔ محمد جعفر اگرچہ خود انشاء پرداز نہ تھے۔ تاہم ان کا ادبی ذوق نہایت پاکیزہ تھا۔ شکیلہ کے مضامین کی اصلاح میں اس کے ادبی ذوق کا ہاتھ تھا۔ کہ چند دنوں کی مشق میں اس کی مضمون نگاری کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ پہلی مرتبہ جب شکیلہ کا "گڑیوں کا بیاہ" والا مضمون رسالہ "پھول" میں شائع ہوا تو اس کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس نے اپنے مضمون کو بے شمار بار پڑھا اور ہر بار ایک نئی خوشی حاصل کی۔ اشعار کے ساتھ ساتھ اس کو مطالعہ سے خاص شغف تھا۔ جس کتاب کو ہاتھ لگاتی بس ختم کر کے دم لیتی اخبار اور رسائل تو اس کی جان تھی۔ سرورق سے لے کر آخری صفحہ کے آخری جملے تک

پرنٹر پبلشر کے نام پڑھ کر چھوڑ دیتی۔

خاک نشین تنویر کے مضامین کا وہ عرصہ سے مطالعہ کر رہی تھی۔ اس کے مضامین شکیلہ کو بہت پسند تھے۔ ایک بار محمد اصغر نے کوئی نیا رسالہ شکیلہ کو لاکر دیا اور اس کی بڑی تعریف کی۔ شکیلہ نے رسالہ لیتے ہوئے کہا ابا جان! اس میں کوئی خاک نشین کا بھی مضمون ہے۔ محمد اصغر نے جواب دیا۔ ہاں! ان کا ایک بہت اچھا مضمون اس میں شامل ہے۔ شکیلہ نے سب سے پہلے اسی کو پڑھا۔

تنویر کے یوں تو سارے مضامین اچھے ہوتے تھے۔ لیکن یہ مضمون دراصل تنویر کا شاہکار تھا جس میں پردے کی خصوصیات پر فلسفیانہ انداز سے بحث کی گئی تھی۔ اس مضمون میں تنویر نے بعض کتابوں کا حوالہ دیا تھا جن کے مطالعہ کا شکیلہ کو بیحد اشتیاق پیدا ہو گیا۔ اس نے بعض مطابع کی فہرستیں اٹھا کر دیکھیں مگر ان کتابوں کے نام نہ ملے۔ ماہرین نفسیات نے نسوانی فطرت پر بحث کرتے ہوئے اس چیز پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ مرد کے مقابلہ میں عورت فطری طور پر زیادہ متجسس واقع ہوتی ہے۔ وہ اور تجسس عورت کی طینت کا خمیر ہے۔ پھر شکیلہ کا تجسس کسی خانگی معاملہ اور گھریلو واقعہ سے متعلق نہ تھا۔ اس کو کتابوں کی تلاش تھی۔ ادب کی تشنگی اور معلومات کی پیاس کو بجھانے کے لئے اس نے بہت سے کتب خانوں کے مالکوں سے خط و کتابت کی لیکن کہیں سے بھی تشفی بخش جواب نہ آیا۔ اب شکیلہ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ خود صاحب مضمون سے مراسلت کی جائے۔ مگر وہ خاک نشین کے پتہ سے بے خبر تھی رسائل کے ایڈیٹروں سے پتہ آسانی سے معلوم ہو سکتا تھا لیکن اس جسارت کے لئے

وہ تیار نہ تھی۔

طلب صادق کی کشش اپنے اندر جس قدر زور اور گہرائی رکھتی ہے۔ اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس منزل میں جادہ پیمائی کر چکے ہوں۔ یقین جانیے کہ طلب صادق کا زور پہاڑوں کی جڑوں کو ہلا سکتا ہے۔ سمندر کی موجوں سے ٹکرا سکتا ہے۔ آسمان کی بجلیوں کا مقابلہ کر سکتا ہے یہ کوئی شاعرانہ مبالغہ نہیں ہے بلکہ ایک ناقابل ابطال حقیقت ہے جس کے ثبوت کے لئے تاریخ کے اوراق میں بہت سے واقعات محفوظ ہیں۔ پھر مس ٹلی کی طلب صادق آخر کیوں رائیگاں جاسکتی۔ چند دن میں اس کے اثرات ظاہر ہو گئے یعنی ایک رسالہ میں خاک نشیں کا پتہ مل گیا۔ خاک نشیں کا پتہ دیکھ کر اس کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس نے اولین لمحہ فرصت میں خاک نشیں کو یہ مضمون خط لکھا۔

جنابِ من تسلیم

رسالہ فردوس میں آپ کا مضمون جس کا عنوان "پردہ پر قیاسی تبصرہ" تھا میری نظر سے گذرا۔ میں عرصے سے آپ کے گراں قدر مضامین کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ لیکن آپ کے اس مضمون نے مجھے تمام مضامین سے زیادہ متاثر کیا۔ آپ نے اقوال کے سلسلہ میں جن کتب کا حوالہ دیا ہے ان کے مطالعہ کا مجھے بے حد شوق ہے۔ براہ کرم فرمایئے کہ کتب متذکرہ کہاں سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ میں آپ کی اس نوازش کی بہت شکر گزار ہوں۔

راقمہ۔ ٹلی

تنویر کے مضامین کی مدیران جرائد و رسائل نے اپنے شذرات خصوصی میں بارہا تعریف کی تھی۔ ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے متعدد مدحیہ خطوط اس کو موصول ہوئے تھے۔ غرض تنویر کی اس قدر تعریف کی گئی تھی، کہ وہ ستائشی خطوط اور مدحیہ مقالات کو پڑھ کر کوئی خاص خوشی حاصل نہ کرتا تھا۔ مگر شکیلہ کے خط کو پڑھ کر تنویر نے اپنے دل کی گہرائیوں میں ایک خاص قسم کا کیف محسوس کیا۔ اس نے شکیلہ کے خط کو بار بار پڑھا اور ہر بار ایک نئی لذت حاصل کی، اس کے پڑھنے کے بعد تنویر کی عجب حالت ہو گئی۔ پہلے تو اس نے پردہ والے مضمون کو کئی مرتبہ پڑھا۔ اس سے فارغ ہوا تو اپنی نظمیں ترنم کے ساتھ پڑھیں۔ نظم پڑھتے پڑھتے آئینہ میں کئی بار اپنا چہرہ دیکھا اور سادہ مزاج تنویر اپنے چہرہ کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ کر خود ہی مسکرا دیا جب اس ایکٹنگ (اداکاری) سے فرصت ملی تو اس نے شکیلہ کو مختصر سا جواب لکھا جو کتابوں کے پتہ پر مشتمل تھا۔ اس خط کا آخری جملہ یہ تھا۔ "آپ نے جن الفاظ میں میرے مضامین کی ستائش کی ہے۔ اس کے مطالعہ نے مجھے مغرور بنا دیا"۔

شکیلہ کو۔ خاک نشیں تنویر کے خط کا بڑی بے چینی سے انتظار تھا۔ پوسٹ مین کو دیر ہو جاتی تو ملازم کو پوسٹ آفس بھیجتی شکیلہ کے پاس اس کے اعزا و اقارب کے بہت زیادہ خطوط آتے تھے مگر اب اس کو عزیزوں کی خیریت سے زیادہ خاک نشیں کے جواب کا انتظار تھا۔ آخر ایک دن ڈاکیہ نے آواز دی اور ملازم کو ایک لفافہ دے کر روانہ ہو گیا۔ نوکر نے لفافہ اندر بھجوایا۔ شکیلہ نے گھبرا کر لفافہ کھولا، یہ معلوم کر کے کہ خط خاک نشیں کا تھا۔ اس کی مسرت کی کوئی انتہا نہ

رہی۔ پہلی نظر میں وہ سارا خط پڑھ گئی مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر ذرا غور سے پڑھا لیکن ابھی صرف کتب خانہ کے پتہ کا وقوف حاصل ہوا۔ تیسری بار اس نے ٹھہر ٹھہر کر خط پڑھا اور آخری جملہ پر اس کی نظر جم کر رہ گئی۔ نہ معلوم تنویر نے اس جملہ میں کیا افسوں بھر دیا تھا۔ کہ شکیلہ کی نبض کی رفتار یکایک تیز ہو گئی۔ اس جملہ کا ایک ایک لفظ اس کے معصوم دل میں تیر و نشتر بن کر اتر رہا تھا۔ اس کی روح پر کاوش و بالیدگی کی متضاد کیفیتیں طاری ہو رہی تھیں۔ ایک گھنٹہ سے زائد وہ ان چند سطروں کے مطالعہ میں صرف ہو گیا اور اگر ملازمہ اس کو آواز نہ دیتی تو نہ معلوم کب تک وہ اس صحیفۂ محبت کا سراپا نگاہ بن کر مطالعہ کرتی رہتی۔ ملازمہ کی آواز نے شکیلہ کو احساسِ محبت کی کچی نیند سے چونکا دیا۔ وہ نشیلی آنکھوں کو رنگین ہتھیلیوں سے ملتی ہوئی اٹھی اور صحن میں پہنچنے سے پہلے اس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔ "تم کو مغرور ہونا ہی چاہیئے"۔

شام کو شکیلہ کے باپ دفتر سے واپس ہوئے تو انہوں نے ایک ادبی رسالہ بیٹی کو لا کر دیا۔ شکیلہ نے رسالہ میز کی دراز میں رکھ دیا۔ شب کو کھانے سے فراغت ہوئی تو اس نے رسالہ کو پڑھنا شروع کیا۔ شکیلہ کے دل میں تنویر کے خط سے ایک خاص قسم کی کسک پیدا ہو گئی تھی۔ مگر حاکِ نفیس (تنویر) کی نظم کو دیکھ کر جس کا عنوان "احساسِ محبت" تھا، وہ کھلا اٹھی۔ تنویر کو شعر گوئی پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ اس کی نظمیں جن کے عنوانات "بنفشہ کا پھول" "لالۂ صحرا" "پروانہ کی کاوش" اور "پیچیدہ فکر" تھے۔ ملک میں بڑی قبولیت حاصل کر چکی تھیں مگر

ان تمام نظموں میں شعور و ادراک اور خارجی موثرات کی کارفرمائی تھی۔ یہ نظم اس نے شکیلہ کا خط پہنچنے کے بعد کہی تھی اسی نظم کو اس نے دماغ کی ندرت اور شعور و ادراک کی لطافت سے نہیں سنوارا تھا، بلکہ خونِ دل کے قطروں اور مجروح محسوسات سے مرتب کیا تھا۔ ایک ایک مصرعہ میں اس نے سوز بھر دیا تھا۔ ایک ایک لفظ کا دل اس نے محبت کے نشتر سے چیر دیا تھا۔ ایک ایک بندش کی معنوی گہرائی میں اس نے محبت کی آگ بھر دی تھی۔ نظم نہ تھی محبت کا مکمل افسانہ تھی، عشق کی روداد تھی، دلی جذبات کی ترجمانی تھی۔ یوں تو ہر سخت سے سخت دل پر اس سحر انگیز نظم نے اثر کیا ہوگا مگر شکیلہ جو فی الفور اس نظم کی مخاطب تھی اور جس کے دل میں خود اس تیر کی کسک موجود تھی، جو تنویر کے دل کو برما چکا تھا۔ از خود رفتہ ہو گئی۔ اسی عالم وارفتگی میں اس نے تنویر کو ایک مفصل خط لکھا۔ جن کے چند ٹکڑے یہ تھے۔

آہ! محبت کتنی لطیف شے ہے۔ مگر اس کا اولین احساس شاید خود محبت سے زیادہ لطیف ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ شاعروں کی بات مبالغہ سے خالی نہیں ہوتی میں کیسے لوگوں کی بات کا یقین کر لوں۔ جب کہ میری بیقرار نظروں کے سامنے ایک ایسی نظم ہے جو حقائق بکنار اور معارف در آغوش، اس نظم کی سچائی کی تصدیق میری روح کر رہی ہے۔ ان اشعار کی صداقت کا شاہد میرا دل ہے وہ لوگ جن کو بدقسمتی سے شعر سمجھنے کی صلاحیت قدرت نے عطا نہیں کی۔ کاش وہ میرے دل کی دھڑکن نبض کی جنبش، روح کے اضطراب اور محسوسات کے ہیجان کا اندازہ لگا سکتے، تو ان کو اپنے ان باطل دعاوی پر کس قدر ندامت ہوتی آہ! احساس محبت کتنا

لطیف عنوان ہے۔ لیکن کیا میں شاعر سے دریافت کر سکتی ہوں کہ "احساسِ محبت کے موثرات کیا ہیں؟"

تنویر کو شکیلہ کا خط ایسے وقت ملا جب کہ وہ ایک مشاعرہ (لائیٹ ہوم) میں جانے کے لئے بالکل تیار تھا۔ صرف شیروانی پہننا باقی رہی تھی۔ شکیلہ کے خط نے اس کی رگ رگ میں بجلیاں دوڑا دیں۔ ایک ایک لفظ پر ایک ایک نگاہ سے ٹھوکر کھاتی۔ ایک ایک جملہ نے اس کے دل میں چٹکی لی۔ مسرت نے اس کو دیوانہ بنا دیا۔ خوشی نے اس کو وارفتہ کر دیا۔ کئی بار مسکرایا اور کئی بار رو دیا۔ چند منٹ کے لئے خط کو لئے ہوئے کمرہ میں لیٹ گیا۔ کچھ دیر کے بعد جب والہانہ حالت اعتدال پر آئی تو اس نے اپنی نظم کو پڑھنا شروع کیا۔ تنویر کو اپنی نظم پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا تھا کہ مکان کا ایک ایک ذرہ وجد کر رہا ہے اور در و دیوار کو حال آ رہا ہے۔ اس کو اپنی نظم کی کامیابی کا آفتاب کی روشنی سے زیادہ یقین تھا۔ اسی جوش میں اس نے شکیلہ کو یہ خط لکھا۔

•

محبت کے موثرات کا مجھ سے سوال کیا جاتا ہے؟ آہ! نسیمِ صبح کلیوں سے پوچھتی ہے کہ تم کیوں مسکرا رہی ہو۔ چاند چکور سے دریافت کرتا ہے کہ تو کس کی جستجو میں بھٹک رہی ہے۔ سرو قمری سے خطاب کرتا ہے کہ تجھے کس کی یاد نے بے چین کر رکھا ہے۔ رباب کو چھیڑ کر اس سے دریافت کیا جاتا ہے کہ تو کیوں نغمہ زن ہے۔ خرمن کو آگ لگا کر خرمن ہی سے پوچھا جاتا ہے کہ تیری شعلہ افشانی کا باعث کیا ہے؟ "احساسِ محبت" بہت ہی لطیف عنوان ہے لیکن جس اس سے لطیف تر

شے ہے۔ خدا کے لئے زخمی دلوں اور تڑپتی روحوں سے اس قسم کا مذاق نہ کیجئے۔ اندازہ لگائیے اگر تپتی ہوئی زمین سے بادل کے ٹکڑے اپنی تشنگی کا گلہ کرنے لگیں۔ تو زمین کا کیا حال ہوگا؟ آپ کی روح اور مضطرب! آہ اتنا سفاکانہ مذاق ہو! اس درجہ کفر انگیز پیام! متموج دریا کو ریت کے تودوں سے پانی کے چھینٹوں کی تمنا۔ آفتاب کو شبنم کے قطروں سے حرارت کی آرزو! خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیجئے جن کے تصور سے میری روح گھبرا اٹھتی ہے۔ میری نظم پر آپ کا اظہار پسندیدگی میری کتاب زندگی کا ایک جدید باب ہے۔ لیکن میں آپ سے دریافت کر سکتا ہوں کہ میری نظم کے اسباب پسندیدگی کیا تھیں؟"

اگرچہ تنویر نے شکیلہ کے خط کا جواب فوراً دے دیا تھا۔ لیکن شدید بارش کے باعث ریلوے لائن خراب ہوگئی۔ اسلئے ڈاک کے پہنچنے میں تعویق ہوگئی بہر حال تنویر کا نامہ محبت شکیلہ کو اسوقت ملا جب کہ وہ انتظار کی گھڑیاں بڑی بے چینی سے گذار رہی تھی۔ تنویر کے خط کو پڑھ کر شکیلہ کے جذبات میں تلاطم پیدا ہوگیا وہ خط ملتے ہی جواب لکھنے بیٹھ گئی مگر قلم کو گرفت میں لیتے ہی جذبات کا سیلاب امنڈ آیا جس کا اظہار بذریعہ تحریر محال تھا کئی کاغذ لکھ لکھ کر چاک کر دیئے کیونکہ جذبات کی ترجمانی کے لئے وہ سب ادھورے اور ناقص تھے۔ آخر کار اس نے مختصر تمہید کے بعد اس جملہ پر خط کو ختم کر دیا کہ۔

"محبت کا جواب صرف محبت سے دیا جاسکتا ہے۔ لیکن ہاں آپ تو مجھے سفاک سمجھتے ہیں۔"

تنویر نے شکیلہ کے اس مختصر خط کا جواب بھی مجمل دیا۔ لیکن اس کی تحریر کا ایک ایک لفظ سوز و گداز میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے جواب میں لکھا۔

"فلسفۂ محبت کی شرح، وہ بھی آپ کی قلم سے، واللہ حیات جاوداں کا گمان ہونے لگا۔ میں آپ کو صاحبِ عقل بھی سمجھتا ہوں اور پیکرِ خلوص و کرم بھی۔ میں آپ کو قابل بھی سمجھتا ہوں اور سیماب بھی۔ اس اختلاف کی وجہ میں کیا بتاؤں۔ اپنے دل سے کچھ پوچھیے، اپنی مخمور نگاہوں سے دریافت کیجیے۔ اپنے شباب کو مسئول بنائیے۔۔۔ آپ اپنے نام "ش" لکھتی ہیں لیکن کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ اس سے کیا مراد ہے۔ میرے خیال میں تو یہ حرف "شراب و شباب" کی ترجمانی کرتا ہے۔ کیونکہ آپ کے اسلوب نگارش میں جوانی کی بے پناہ جھلک پاتا ہوں اور آپ کی تحریر اس درجہ کیف انگیز ہے کہ اس کے پڑھنے کے بعد مجھے پہروں ہوش نہیں رہتا۔ اس معما کو حل فرمائیں گی۔"

تنویر کا خط جس روز شکیلہ کو موصول ہوا اسی دن وطن سے شکیلہ کے چچا جان کی موت کا تار آیا۔ اور وہ بھی شرح سے والد کے ساتھ روانہ ہو گئی۔ تنویر کے خط کو ایک نظر دیکھ کر اس نے صندوقچے میں رکھ لیا۔ چچا جان کی موت نے اس کے حواس مختل کر دیئے تھے۔ وہ ایسی حالت میں کیا جواب دیتی۔ لیکن اس سوگوار حالت میں بھی اس کا دل تنویر کی طرف سے غافل نہ تھا۔ تنویر نے جواب کا چند دن انتظار کرنے کے بعد شکیلہ کو ایک مفصل خط لکھا۔ شکیلہ کے والد چچا جان کی موت کی گھبراہٹ میں ڈاک کا کوئی انتظام نہ کر سکے۔ نہ انہوں نے ڈاک خانہ میں اپنی منتقلی کی اطلاع دی اور نہ کسی ملازم کو مکان پر چھوڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تنویر

کا خط بجنسہٖ اس کو واپس مل گیا۔ تنویر پر خط کی واپسی کا بڑا اثر ہوا۔ اس نے پھر ایک رجسٹری شدہ مکتوب ارسال کیا۔ لیکن اس کا بھی وہی حشر ہوا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ "مصیبت تنہا نہیں آتی"۔ تنویر کو اتنی زندگی میں اس ضرب المثل کی صداقت کے دردناک مناظر دیکھنا پڑے۔ یعنی اس کے والد پر زبردست فالج کا حملہ ہوا جس کے باعث وہ جانبر نہ ہو سکے۔ باپ کی موت کا زخم ابھی مندمل نہ ہونے پایا تھا کہ اس کے چچا دنیا سے چل بسے۔ باپ اور چچا کی موت نے تنویر کو نیم جان بنا دیا۔ ان بزرگوں کے مرتے ہی خانگی جھگڑے شروع ہو گئے۔ تنویر کے والد سیدھے سادے مسلمان تھے۔ سارا کاروبار چھوٹے بھائی پر چھوڑ رکھا تھا۔ حتیٰ کہ بنک میں روپیہ بھی بھائی کے نام جمع تھا۔ دوسرے تجارتی کاروبار بھی بھائی کے نام سے ہوتے تھے۔ بھائی انتہائی دیانتدار اور لائق تھا۔ اس بندۂ خدا نے کبھی ایک پیسہ بھی اِدھر سے اُدھر نہ کیا مگر اس کے بیٹے باپ کی ضد تھے۔ باپ دیانتدار تھا یہ پرلے درجے خائن تھے۔ باپ بامروت تھا، یہ نہایت ہی خود غرض اور طوطا چشم تھے۔ انہوں نے باپ کے مرتے ہی تنویر کو کورا جواب دے دیا۔ تنویر نے بہت کچھ منت وسماجت کی لیکن ان اشقیا کا دل مطلق نہ پسیجا۔ جب ادھر سے اُمید منقطع ہو گئی تو اس نے بدرجہ مجبوری عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر عدالت تحریری ثبوت کے مقابلہ میں زبانی باتوں کا کیا اثر لیتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تنویر کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ تنویر بالکل بے یار و مددگار رہ گیا۔ وہ لوگ جو اس کے باپ سے سینکڑوں کا فائدہ حاصل کرتے تھے تنویر کو دیکھ کر کترانے لگے۔ احباب و اعزا کی اس بے اعتنائی نے تنویر کے

دل کو پاش پاش کر دیا۔ اس زہر گداز افکار و آلام نے اس کے دل و دماغ پر آشفتہ اثر ڈالا کہ
اس کی طبیعت شعر و ادب سے بالکل اُچاٹ ہو گئی۔ پیٹ کا سوال بڑا ٹیڑھا سوال ہے
تنویر کو آب و دانہ کی خاطر وطن چھوڑ کر کلکتہ آنا پڑا جہاں وہ ایک فرم کا منیجر ہو گیا اس
فرم سے اس قدر شعبہ جات متعلق تھے کہ تنویر کو دم لینے کی فرصت نہ تھی۔ صبح سے
شام تک گھوڑے کی طرح جتا رہتا۔ غرض تنویر اب ہندوستان کا مشہور ادیب
خاک نشین نہ تھا بلکہ ایک فرم کا منتظم اور قابل منیجر تھا۔ کملیہ بھی وطن پہنچ کر بیمار
ہو گئی۔ علالت نے کافی طول کھینچا اور دونوں کا سلسلہ مراسلت منقطع ہو گیا۔

شاہ امان اللہ خان کا سفر مغربی سفر فی الحقیقت دنیا کی تاریخ میں زریں حروف
میں لکھا جائے گا۔ تاریخ کسی مشرقی فرمانروا کو پیش نہیں کر سکتی جس کا مغربی ممالک
میں اس قدر شاندار استقبال ہوا ہو اور جس کی سطوت نے پاپائے روم کے مقدس
خلوت کدے اور قصر بکنگھم کے مکینوں سے خراجِ عقیدت وصول کیا
ہو۔ شہریارِ کابل کی ہندوستان میں آمد اس قدر ہنگامہ خیز تھی کہ پشاور سے
لے کر راس کماری تک ایک غلغلہ برپا ہو گیا تھا۔ جب ہندوستان کی سرزمین پر
شاہِ غازی نے پہلا قدم رکھا تو نہیں کہا جا سکتا کہ کتنے دل تھے جو فرشِ راہ بن
گئے۔ اور کتنی آنکھیں تھیں جو زمین پر عقیدت سے بچھ گئیں۔ بمبئی میں شہریارِ معظم
کا جس قدر پُرجوش استقبال کیا گیا اس کی نظیر تاریخِ ہند میں مشکل ہی سے ملے گی
مشتاقانِ دید ملک کے اطراف و اکناف سے اس کثرت سے بمبئی پہنچے کہ
بمبئی کے کثیر التعداد فراخ و وسیع ہوٹلوں میں جگہ باقی نہ رہی۔ تنویر ملازم ہونے کے

بعد اس درجہ منہمک رہا کہ کہیں ایک دن کے لئے باہر نہ جا سکا۔ یہ موقع تبدیل مقام کے لئے اچھا ہاتھ آگیا۔ فرم کے مالک نے بھی بہ خوشی اجازت دے دی تنویر شاہ کے آنے سے تین دن پہلے بمبئی پہنچ گیا۔

شکیلہ کے بھائی ارشد کو سیاست سے بڑی دلچسپی تھی۔ بھائی کے ذوق کی بدولت بہن کو بھی پالٹکس سے قدرے لگاؤ ہو گیا تھا اگرچہ وہ سیاسیات کے پیچیدہ مسائل کو نہ سمجھ سکتی تھی۔ تاہم اسمبلی اور کونسلوں کی کارروائیوں، پارلیمنٹ کے اجلاسوں کی روداد اور غیر ملکی خبروں کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کرتی تھی۔ شاہ امان اللہ خان کی آمد نے دونوں بہن بھائیوں کے دلوں میں اشتیاق کی ایک لہر دوڑا دی اور دونوں نے بمبئی آکر شاہ موصوف کے دیدار سے مشرف ہونے کا عزم بالجزم کر لیا۔ شکیلہ کے والد بڑے جز رس اور کفایت شعار تھے۔ انہوں نے ابتدا میں بمبئی جانے کی مخالفت کی لیکن بعد میں راضی ہو گئے۔ باپ کے راضی ہونے کی دیر تھی، یہاں تو ہر چیز تیار تھی۔ لہٰذا دونوں بہن بھائی اول ٹرین سے روانہ ہو کر بمبئی پہنچ گئے۔ ارشد بہن کو لئے ہوئے صبح کے ۹ بجے وکٹوریہ اسٹیشن پر پہنچا، اسٹیشن پر ہوٹل کے نمائندے سے ملاقات ہو گئی جس میں تنویر قیام پذیر تھا۔

تنویر صبح کو میوزیم چلا گیا سو ہاں سے گیارہ بجے کے قریب واپس ہوا۔ اپنے کمرہ میں آکر اس نے تھوڑی دیر آرام کیا۔ پھر ہاتھ منہ دھویا۔ اتنے میں لنچ کی گھنٹی بجی اور وہ ڈرائنگ روم کی طرف چل دیا۔ تنویر کھانے کے کمرہ کے بڑے دروازہ پر پہنچا ارشد اور ہوٹل کے ایک ملازم میں قدرے تلخ گفتگو ہو رہی تھی۔ تنویر کو

دیکھتے ہی ملازم نے ارشد کو مخاطب کر کے کہا۔

"صاحب! دیکھئے یہ بھی تو مسافر ہیں کہ کبھی کسی بات پر معترض ہی نہیں ہوتے اور ہوٹل کے قواعد کی پوری پابندی کرتے ہیں" تنویر نے ملازم سے اصل واقعہ دریافت کیا۔ ملازم نے کہا۔ "آپ جانتے ہیں کہ دونوں امیر کابل کی آمد کے باعث ایک مخلوق بمبئی میں ٹوٹ پڑی ہے۔ ہمارے ہوٹل کا یہ حال ہے کہ تمام کمرے مسافروں سے پٹے پڑے ہیں۔ ہمارے ہاں گنے چنے ملازم ہیں۔ یہ دن کچھ ایسی ریل پیل کے ہیں کہ نئے ملازموں کا دستیاب ہونا مشکل ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے ناممکن ہے کہ ہر فرد پہ جا کر فرداً فرداً کھانا پہنچائیں۔" اس پر ارشد نے ترش رو ہو کر کہا۔ "یہ ہوٹل ہے یا بھٹیار خانہ۔ غضب خدا کا پردہ نشین عورتوں کو کس طرح ڈائننگ روم میں غیر مردوں کے ساتھ کھانے کے لئے بٹھا دیا جائے۔" تنویر نے ارشد سے انگریزی میں کہا کہ آپ اس ملازم سے نہ الجھئے میں مینجر سے جا کر ملتا ہوں۔ تنویر وہاں سے فوراً مینجر کے پاس پہنچا اور اس کو سمجھا کر ارشد کی منشا کے مطابق معاملہ طے کرا دیا۔ اس گفتگو میں اتنا وقت صرف ہو گیا کہ لنچ کا وقت گذر گیا۔ تنویر کی اس ہمدردی کا ارشد پر بہت اثر ہوا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے تنویر کے کمرہ میں آ کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور اس کے حسن اخلاق سے ارشد بے حد متاثر ہوا۔ ارشد نے شکیلہ سے جا کر تنویر کے اخلاق کی بیحد تعریف کی اور باہمی گفتگو کے چند پر لطف ٹکڑے بھی سنائے۔

ارشد بمبئی میں بالکل نووارد تھا۔ اجنبی مقام پر کسی سے ذرا سی شناسائی بھی

بڑے سہارے کا باعث ہوتی ہے پھر ارشد کا تعارف ایک ایسے شخص سے ہوا تھا جو اخلاق کا مجسمہ اور انکسار و تواضع کا پیکر تھا۔ شکیلہ کے باپ اگرچہ عادات و اطوار کے اعتبار سے بالکل ہندوستانی مسلمان تھے مگر پردے کے معاملہ میں قدرے آزاد واقع ہوئے تھے۔ یعنی خاص شناساؤں اور ملنے جلنے والوں سے ان کے یہاں پردہ نہ تھا لہٰذا اُس نے بہن سے تعارف کرانے میں کوئی قباحت محسوس نہ کی بلکہ تنہائی اور غربت کو دور کرنے کے لئے اس نے شکیلہ سے تنویر کے تعارف کو مناسب سمجھا۔ ارشد نے بہن سے اس خصوص میں مشورہ کیا اور وہ بھی اس کے لئے آمادہ ہوگئی۔ شام کے پانچ بجے تنویر نہا دھو کر فارغ ہوا تھا کہ اتنے میں ارشد اس کے کمرہ میں آگیا اور اس نے تنویر سے اپنے کمرہ میں چلنے کی درخواست کی۔ تنویر نے اس پُرخلوص دعوت کو بڑے شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔

تنویر نے ارشد کے کمرہ میں پہلا قدم رکھا تھا کہ شکیلہ مسکرا کر استقبال کے لئے آگے بڑھی اور تنویر سے نہایت تپاک کے ساتھ ملایا شکیلہ کی مسکراہٹ تنویر کے دل کی دنیا پلٹ چکی تھی۔ ہاتھ ملانا اور غضب ہوگیا وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے جسم میں بجلیاں سرایت کر رہی ہیں اور اس کی رگ و پے میں ایک کیف آفرین ہیجان بپا ہوگیا ہے۔ ارشد چونکہ تنویر کے متعلق پہلے کچھ حالات معلوم کر چکا تھا۔ لہٰذا اُس نے شکیلہ سے تنویر کا اجمالی تعارف کرایا۔ اس کے بعد ارشد نے گھنٹی بجائی جس پر ہوٹل کا ملازم چائے کی کشتی لئے ہوئے کمرہ میں داخل ہوا۔ ملازم کشتی کو میز پر رکھ کر باہر چلا گیا۔ شکیلہ نے نہایت سلیقہ کے ساتھ چائے بنائی اور پہلی پیالی

تنویر کو پیش کی۔ تنویر نے عقیدت سے متوحش ہو کر آداب کیا۔ تنویر نے پیالی کو پکڑ کر منہ تک لیجانا چاہا۔ لیکن اس کے ہاتھوں میں ایک خفیف سا ارتعاش پیدا ہو گیا۔ ارشد کے خیال سے اپنی اس بے اختیاری پر اسے بڑی ندامت ہوئی تھی۔ لہٰذا چائے کو چھوڑ کر اس نے کیک کا ایک ٹکڑا اٹھا کر بڑی عجلت سے منہ میں رکھ لیا۔ تنویر عجب مصیبت میں گرفتار تھا۔ ایک طرف شکیلہ کی فراوانی اپنی پوری قوت اور بے پناہ جوش کے ساتھ اس کے ضبط اور صبر کی غارتگری کر رہی تھی۔ دوسری جانب ارشد کی موجودگی کا احساس۔ بظاہر متانت و سنجیدگی آموز محتاط درس دے رہا تھا۔ اس کے جذبات کا تقاضا تھا کہ شکیلہ کی ایک ایک ادا کو سجدہ کیا جائے۔ ایک ایک انداز پر صبر و سکون کی ساری دولت کو بے دریغ قربان کر دیا جائے لیکن مصلحت وقت کا اقتضا تھا کہ وہ اس طرح بیٹھا رہے گویا اس کے پہلو میں دل کی بجائے شیشہ کا ٹکڑا رکھا ہے اور شکیلہ کی مخمور آنکھوں سے وہ بالکل متاثر نہیں ہوتا۔ اور اس کے حشر بدوش تبسم کی جانب وہ مطلق اعتنا کرنا نہیں چاہتا۔ چند منٹ تک خاموشی طاری رہی، اس سکوت کو شکیلہ کے اس جملہ نے توڑا۔

"جانی جان! ہم شاہ امان اللہ خاں کی سواری کا منظر کہاں سے دیکھیں گے" ارشد نے کہا اس کا فیصلہ تو تنویر صاحب پر چھوڑتا ہوں۔ آپ دو چار مرتبہ پہلے جا بھی چکے ہیں۔" تنویر نے جواب میں کہا۔ "میرے نزدیک کرافرڈ مارکیٹ بہترین مقام ہے، آپ لوگ راضی ہوں تو میں اپنے ایک دوست کو ابھی فون کر دوں وہ تین نشستوں کو ابھی محفوظ کرا دیں۔" شکیلہ نے اس پر مسکرا کر کہا۔ حضرت

نیکی اور پوچھ پوچھ ۔ ہم تو بمبئی کی ظلمات میں آپ کو خضر بنا چکے ہیں ۔ تھوڑی
بات چیت کے بعد یہ صحبت برخاست ہو گئی ارشد نے تنویر کی تکلیف فرمائی کا
شکریہ ادا کیا۔

تنویر نے اپنے کمرہ میں آکر اطمینان کی سانس لی متضاد قوتوں نے جو اسکی رو
کو کشمکش میں ڈال دیا تھا اس سے یہاں آکر نجات ملی ۔ تنویر نے کمرہ کا دروازہ لگ
اور آج کی ملاقات پر تبصرہ کرتا رہا ۔ اسکی تمام رات اسی عالم میں بسر ہوئی ۔ خواب ب
کئی بار اُس نے شکیلہ سے گفتگو کی کئی بار اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالیاں
کر نوش کیں ۔ تنویر خواب دیکھ رہا تھا کہ شکیلہ نے قہوہ کی فنجان اس کو پیش کی ا
نے شکیلہ کا ہاتھ چومنے کے لئے خفیف سا اقدام کیا کہ اتنے میں ارشد کمرہ میں
گیا ۔ تنویر کے ہاتھ سے پیالی چھوٹ گئی اس پر ارشد نے کہا ۔ جناب بدحواس
ہو جئے دیکھیے میز پوش خراب ہو گیا ۔ تنویر کا دل دھک دھک کرنے لگا اور ا
حالت میں اسکی آنکھ کھل گئی ۔

آج صبح تنویر کی زندگی کی بالکل نئی صبح تھی اس کی آنکھوں نے سورج کی کر
کو اس سے پہلے اس درجہ رنگین کبھی نہیں دیکھا تھا نسیم صبح کے جھونکے اس قدر کیف
انگیز کبھی محسوس نہیں ہوئے تھے ۔ تنویر اٹھا اور انگڑائیاں لیتا ہوا اٹھا ۔ ای
معلوم ہوتا تھا کہ اس نے رات بھر شراب پی ہے ۔ اسوقت صبح کے آٹھ بج چکے
تنویر کو نو بجے سے قبل کرافرڈ مارکیٹ پہنچ جانا تھا ۔ لہٰذا اُس نے جلدی جلدی
کپڑے پہنے اور تین چار منٹ میں بن ٹھن کر ارشد کے کمرہ میں پہنچ گیا ۔ شکیل

اور ارشد دونوں تنویر کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تنویر کے آتے ہی دونوں کھڑے ہو گئے۔ شکیلہ نے مزاج پرسی کرتے ہوئے تنویر سے کہا "معلوم ہوتا ہے آپ صبح کو دیر سے اٹھنے کے عادی ہیں" تنویر نے نہایت سادگی سے جواب دیا "دیر سے اٹھنے کا تو عادی نہیں ہوں رات ذرا دیر سے نیند آئی تھی"

شکیلہ ایک آرٹ خود حسن مکمل اور شباب مجسم تھی۔ اس کی ارغوانی آنکھیں میخانہ بدوش اور اس کے رنگین رخسار گلستاں بکنار تھے۔ اس کی مسکراہٹ بے شمار بجلیوں کو دعوت رقص دیتی تھی۔ اس کا انداز تکلم کوزہ نبات سے زیادہ شیریں اور بنفشہ کے پھول سے بڑھ کر حسین تھا۔ لیکن آج اس نے اپنی تزئین کچھ اس سلیقہ اور نفاست کے ساتھ کی تھی کہ وہ رعنائیوں میں غرق ہو رہی تھی۔ اس کی روح کو وجد آرہا تھا۔ اگر ارشد کی موجودگی کا سنگ گراں اس راہ میں حائل نہ ہوتا تو تنویر محبت کے بے شمار سجدے کرتا۔

بمبئی میں آج کا دن بڑی چہل پہل کا دن تھا۔ تمام سڑکیں تماشائیوں سے پٹی پڑی تھیں۔ ارشد، شکیلہ اور تنویر ۹ بجے سے قبل کرافرڈ مارکیٹ پہنچ گئے۔ گیارہ بجے کے قریب ہز مجسٹی شاہ امان اللہ خاں کی سواری وہاں سے گذری اور چیرز کے شور سے در و دیوار گونج اٹھے جب شاہ موصوف مسکرا کر سلام لیتے تھے تو فرط عقیدت اور فرط محبت سے تماشائیوں کی چیخیں نکل جاتی تھیں۔ شکیلہ نے بھی شاہ زندہ باد کے پرجوش نعرے لگائے۔ اگرچہ اس ہنگامے میں شکیلہ کی آواز گم ہو کر رہ گئی۔ لیکن تنویر کے کانوں نے اس قیامت آفریں آواز کو تمام چیخوں اور نعروں سے زیادہ موثر طور پر محسوس کیا

شاہ کی سواری گذرنے کے بعد کئی گھنٹے میں جا کر بھیڑ کم ہوئی تو یہ تینوں تماشائی بڑی دقت کے ساتھ ایک بجے کے بعد ہوٹل پہنچے۔ شام کو ارشد کا ایک ریلوے کے افسر سے ملاقات کا وقت مقرر تھا وہ پانچ بجے ادھر چلا گیا۔ غرض کئی دن کے بعد شکیلہ اور تنویر کو تنہائی کا موقع نصیب ہوا۔

ارشد کو رخصت کرنے کے بعد تنویر اس کے کمرہ میں گیا۔ کئی منٹ تک شکیلہ اور تنویر ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ کتنا پر لطف سکوت تھا۔ کتنی حسین خامشی تھی کس قدر رنگین خلوت تھی نگاہیں زبان کا کام دے رہی تھیں، سانس کی آواز جذبات کی ترجمانی کر رہی تھیں۔ تنویر کی نگاہوں نے نہ معلوم کیا کہہ دیا کہ شکیلہ نے نگاہوں کو جھکا لیا اور اس نے دو تین مرتبہ پیشانی کو رومال سے سہلایا پھر اس ناقابل برداشت سکوت توڑنے کے لئے شکیلہ نے نگاہوں کو جھکا لیا اور اس نے دو تین مرتبہ پیشانی کو رومال سے سہلایا پھر اس ناقابل برداشت سکوت توڑنے کے لئے شکیلہ نے کہا۔

"شاہ امان اللہ خاں کے سفر کی غایت کیا ہے"

تنویر "سفر کی غایت کے متعلق اخبارات مختلف آراء کا اظہار کر رہے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں یہ سفر سیاسی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اور افغانستان کے خارجی تعلقات پر جب تک پورا عبور نہ ہو اسوقت تک کسی یقینی رائے کا اظہار نامناسب ہے"

شکیلہ اور تنویر دونوں سیاسیات کے اس خشک موضوع کو بدلنا چاہتے تھے لیکن ہر شخص اس فکر میں تھا کہ اقدام دوسری طرف سے کیا جائے۔ تنویر پہلی ملاقاتوں میں بہت کچھ بے اختیار ہو گیا تھا۔ اب ذرا بات چیت کا موقع ملا تو اس

کی پہلی سی بے اختیاری کی کیفیت باقی نہ رہی وہ اس کوشش میں تھا کہ جس طرح ممکن ہو اپنی محبت کا شکیلہ پر اظہار کر دے لیکن اظہار محبت کے لئے وہ کوئی تقریب چاہتا تھا۔ تنویر اس کش مکش میں چند منٹ مبتلا رہا۔ جب کوئی موضوع تقریب ذہن میں نہ آیا تو اس نے شکیلہ کو مخاطب کر کے کہا: کیا آپ کے پاس آپ کا کوئی فوٹو بھی ہے:

شکیلہ: میرے ساتھ تو کوئی فوٹو نہیں ہے لیکن آپ یہ فرمائیے کہ آپ میرے فوٹو کا کیا کریں گے:

تنویر: آپ کے فوٹو کا میں کیا کروں گا؟ اس کا جواب مجھ سے نہ مانگئے اپنی سحر بدوش آنکھوں سے پوچھئے اپنے ان نازک و رنگین لبوں سے دریافت کیجئے جن کا بجلیاں اکثر طواف کرتی ہیں:

شکیلہ۔ مسکرا کر: آپ واقعی بڑے سیاسی ہیں خوب بنانا آتا ہے:

تنویر: میں محبت کے مذہب میں سیاست کو کفر اور مصلحت شناسی کو شرک سمجھتا ہوں بخدا میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کی تہ میں حقیقت کے سوا کچھ اور نہیں:

شکیلہ اس سوال کا جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ ارشد کمرہ میں آ گیا۔ ارشد کے آنے سے گفتگو کی ساری بساط الٹ گئی۔ آج کی ملاقات نے تنویر اور شکیلہ کے جذبات میں غیر معمولی ہیجان پیدا کر دیا شکیلہ نے اس قسم کی گفتگو زندگی میں پہلی مرتبہ سنی تھی اور اس کے حسن و شباب کی اس حقیقت سے پہلی مرتبہ تعریف کی گئی تھی۔

ارشد نے ریلوے آفیسر کی ملاقات کی تفصیل شکیلہ کے سامنے بیان کی لیکن شکیلہ کا دماغ کسی اور ہی کرید میں تھا۔ ارشد ریلوے میں ٹھیکہ لینا چاہتا تھا۔ ہی

سلسلہ میں وہ ریلوے افسر سے ملا تھا۔ آج کی ملاقات کے سلسلہ میں اس شام کو پھر ایک شخص سے ملاقات کرنا تھی۔ لہٰذا وہ ۵ بجے کے قریب ہوٹل سے روانہ ہو گیا۔ اور تنویر و شکیلہ کو پھر تنہائی کا موقع مل گیا۔

محبت کی ذرا سی بے تکلفی بھی نہایت قیامت آفرین ہوتی ہے۔ آج شام کی ملاقات تنویر و شکیلہ دونوں کے لئے اس قدر پر لطف اور کیف آگیز تھی کہ ان کی روح پر انبساط کی بارش ہو رہی تھی۔ آج انہوں نے سیر کے لئے باہر جانے کا ارادہ کیا۔ ہوٹل کے منیجر کو فون کیا گیا۔ آن کی آن میں ٹیکسی آگئی۔ اور یہ دونوں اس میں بیٹھ کر سیدھے اپالو پہنچے۔ آج اتوار کا دن تھا۔ اپالو تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ رنگین ساڑیوں کی جنبش نے ساحل کی فضا کو فردوس بنا دیا تھا۔ نوجوان حسین لڑکیوں کے پرے کے پرے گشت کر رہے تھے۔ تنویر اور شکیلہ بھی اس پرستان میں ٹہلنے لگے۔ تھوڑی دیر ٹہلنے کے بعد وہ دونوں ایک بنچ پر جا کر بیٹھ گئے۔ شکیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کہیں بھائی جان ادھر نہ آجائیں وہ ہماری یہاں موجودگی سے نہ معلوم کیا سمجھیں گے؟"

تنویر نے جواب دیا: "اگر وہ آجائیں گے تو کیا ہوگا، کیا ہم کوئی ڈاکہ ڈال رہے ہیں کسی کے خلاف سازش کر رہے ہیں شکیلہ تم کیسی باتیں کرتی ہو، محبت بڑی لطیف شے ہے، اس کا دامن دنیا کی تمام برائیوں اور عیوب سے پاک ہے۔ اگر محبت کرنا جرم اور عشق کرنا گناہ ہے۔ تو پھر تمام دنیا کو پھانسی کے تختہ پر چڑھا دو۔ تمام عالم کو موت کے گھاٹ اتار دو کیونکہ دنیا کا کوئی متنفس محبت سے خالی نہیں

ہے۔ محبت بقائے انسانی کی ضامن ہے۔ محبت کا نور اگر ہم ہیں سے گم ہو جائے
ہماری زندگیاں قطعاً بے کیف اور خشک ہو جائیں اور میں تو محبت کی اس بے
یفی اور خشکی کو موت سمجھتا ہوں :-

شکیلہ :- آپ نے تو دھواں دھار تقریر شروع کر دی میں نے تو مزاحاً کہا تھا۔ اگر
آپ کے دل کو میرے الفاظ سے کچھ صدمہ پہنچا ہو تو میں معافی چاہتی ہوں :-

تنویر نے اس جملہ پر شکیلہ کا بے اختیارانہ طور پر ہاتھ چوم لیا۔ تنویر کی
حرکت پر شکیلہ کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ اس کی دوشیزگی کی ہر کیفیت .....
تھی اس کی معصومیت کا ہر خاموش نغمہ مترنم ہو گیا۔ اس کی نشیلی آنکھوں کے ڈورے
سرخ ہو گئے۔ اس نے تنویر کو محبت کی گہری نظروں سے دیکھا اور خود ہی نگاہیں
نیچی کر لیں۔ غرض شکیلہ نے تنویر کو محبت کے سینکڑوں پیالے پلا دیئے شام
کے ۶ بج چکے تھے۔ شام کی تاریکی نے سمندر کی موجوں کو سیاہی مائل بنا دیا تھا
قریب کے ہوٹلوں سے پیانوں کے نغموں کی یورش نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا
۔ مگر شکیلہ اور تنویر دونوں نے کچھ ایسی شراب پی تھی کہ وہ اس ہنگامہ سے بے خبر
تھے۔ اپالو سے روانہ ہو کر وہ ۱۰ بجے کے قریب ہوٹل پہنچے۔ ارشد اگرچہ
ان لوگوں کے آنے کے بعد ہوٹل پہنچا۔ مگر اس کو دونوں کے باہر جانے کی ملازم
کے ذریعہ خبر مل چکی تھی۔

ارشد کو ابھی ایک ہفتہ کے قریب بمبئی میں رہنا تھا لیکن والد کی علالت
کے تار نے اس کو صبح ہی روانہ ہونے پر مجبور کر دیا۔ تنویر کے لئے شکیلہ کی جدائی

کی خبر بڑی دل شکن تھی۔ اس علیحدانہ مفارقت کے خیال نے اسکی روح کو مضطرب بنادیا۔ رات بھر ماہی بے آب کی طرح تڑپا۔ صبح کو ارشد اور شکیلہ کے ساتھ اسٹیشن پہنچا۔ گفتگو کا کوئی موقع نہ تھا۔ لیکن نگاہیں زبان کا فرض ادا کر رہی تھیں۔ شکیلہ کے معصوم اور شگفتہ چہرے پر اس قسم کی جدائی کے آثار پہلی مرتبہ نمایاں ہوئے جب ٹرین نے روانگی کی سیٹی دی تو شکیلہ کے بدن میں تھرتھری پیدا ہوگئی۔ اس کی نگاہیں نمناک ہوگئیں۔ اگر بھائی کا خیال نہ ہوتا تو وہ بے اختیار چیخ اٹھتی تنویر نے جب ٹرین روانہ ہوتے وقت شکیلہ نے ہاتھ ملایا تو اسکی آنکھوں سے آنسوؤں کے گرم گرم قطرے ٹپک پڑے۔ گاڑی کے جانے کے بعد تنویر پلیٹ فارم کی بنچ پر بیٹھ کر بہت رویا۔ رونے سے جب تسکین ہوئی تو ہوٹل آیا۔ تنویر کو ہوٹل اب سنسان نظر آتا تھا۔ اس نے آتے ہی سامان باندھا اور پہلی ٹرین سے کلکتہ روانہ ہوگیا۔

شکیلہ اور ارشد جب مکان پہنچے تو باپ کی حالت سنبھل چکی تھی۔ لیکن ڈاکٹروں نے رائے دی تھی کہ ان کے قویٰ بہت مضمحل ہوگئے۔ اب اگر علالت کا ذرا سا بھی حملہ ہوا تو جانبر ہونا مشکل ہے۔ محمد اصغر کو بیٹی کی شادی کی بڑی فکر تھی خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ڈاکٹر موت کا فتویٰ دے چکے تھے۔ ان کی فکر بہت زیادہ بڑھ گئی۔ شکیلہ کے باپ کو ارشد پر بڑا غلط اعتماد تھا۔ اکثر خانگی معاملات میں اسی کے مشوروں پر عمل کرتے تھے۔ انہوں نے اس مسئلہ میں بھی ارشد سے مشورہ کیا ارشد بمبئی میں تنویر سے اس سلسلہ کے حالات معلوم کر چکا تھا اور ساتھ ہی بمبئی سے

روانگی کا منظر بھی اس کے پیشِ نظر تھا۔ لہٰذا اس نے باپ سے تنویر کا بڑے اچھے الفاظ میں ذکر کیا دو دن اس بارے میں مشورہ ہوتا رہا۔ آخر سب لوگوں نے ارشد کی رائے پر اتفاق کیا۔ ارشد نے تنویر سے خط و کتابت کی۔ تنویر کو بھلا کیا عذر ہو سکتا تھا۔ اس کے لئے تو یہ پیام سراسر حیات بخش تھا۔ غرض تنویر کی شکیلہ سے بات ٹھہر گئی اس کے بعد تاریخ مقرر ہوئی اور چند دن میں تنویر اپنی محبوبہ کو بیاہ کر کلکتہ لے آیا۔

شکیلہ جہاں حسن کا مجسمہ تھی وہاں سیرت کے اعتبار سے بھی بے مثال تھی اس کا چہرہ گلاب سے زیادہ حسین اور تروتازہ تھا۔ لیکن اس کی طبیعت بلور سے کہیں زیادہ شفاف اور چمکیلی تھی شکیلہ میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں۔ جو ایک بہترین بیوی میں ہونی چاہئیں۔ تنویر تو پہلے ہی سے شکیلہ کا گرویدہ تھا۔ اس کی خوش اخلاقی اور اچھے برتاؤ نے تو تنویر کو اپنا پرستار بنا لیا۔ اور وہ دونوں نہایت ہی مسرت کی زندگی گذارنے لگے۔ تنویر نے شکیلہ کو اپنے بہت ہی مخصوص احباب سے پردہ کرا دیا تھا۔ ان لوگوں میں شمیم بھی شامل تھا۔

شمیم بڑا اچھا مصور تھا۔ شکیلہ کو تصویر کشی سے فطری لگاؤ تھا۔ بچپن میں اس نے اس طرف توجہ کی تھی۔ لیکن کوئی سکھانے والا نہ مل سکا۔ اسلئے اس کا شوق نامکمل حالت میں رہ گیا۔ شمیم سے تعارف ہونے پر اس نے اس طرف توجہ کی تنویر نے بھی بہ خوشی اسے اجازت دے دی۔ تنویر کو شکیلہ پر بڑا اعتماد تھا۔ فی الحقیقت

شکیلہ ایک ایسے مضبوط کیرکٹر کی عورت تھی۔ جس پر ہر طرح اعتماد کرنا ہی چاہیئے تھا۔ شمیم ایسے اوقات میں بھی شکیلہ کو تصویر کشی سکھانے آتا تھا۔ جب تنویر دفتر میں ہوتا تھا۔ لیکن کیا مجال ہے جو شکیلہ کی زبان سے تصویر کشی کے سوالات کے سوا ایک لفظ بھی اِدھر اُدھر کا منہ سے نکل جائے۔ شکیلہ فطرتاً ذہین تھی۔ فنونِ لطیفہ سے اس کو خاص مناسبت تھی۔ چنانچہ چند دِن میں وہ اچھی خاصی تصویر بنانے لگی۔ مشق کے لئے وہ ہمیشہ نئی نئی تصاویر بناتی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے شمیم کے فوٹو کو بڑھانا شروع کیا اور اس میں اپنی چابک دستی کا سارا زور صرف کر دیا۔ تنویر نے شکیلہ کے کمرہ میں شمیم کے فوٹو کو پہلی مرتبہ دیکھا تو اس کے دل میں کوئی خاص خیال پیدا نہیں ہوا۔ لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ شکیلہ تصویر کے بنانے میں پہروں مصروف رہتی ہے۔ تو اس کے دِل میں شک پیدا ہو گیا جو ترقی کر کے بدگمانی کی حد تک پہنچ گیا۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ بدگمانی کی بنیاد ہمیشہ توہمات اور شکوک ہوا کرتے ہیں جو لوگ شک کے پیدا ہوتے ہی اس کے ارتفاع کی کوشش کرتے ہیں تو وہ بدگمانی کی اس خوفناک دلدل سے نکل جاتے ہیں۔ لیکن جو لوگ خامشی کے ساتھ شک کی دلیں پرورش کرتے رہتے ہیں ان کو بدگمانی کے صبر شکن خارزار سے گذرنا ہوتا ہے۔ تنویر نے بھی شک دُور کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ اس کو ایک سربستہ راز کی طرح چھپاتا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا شک ایک مستقبل بدگمانی میں تبدیل ہو گیا۔

شمیم ایک دن شکیلہ کی دھوئی ہوئی پلیٹوں کو دیکھنے کے لئے صبح ۹ بجے آیا۔ بعض تصاویر کے متعلق ہدایات دینے میں کافی دیر لگ گئی۔ گرمی کا موسم تھا اس نے اپنی شیروانی اتار کر ایک کوچ پر رکھ دی۔ شمیم نے اپنے دوست کو جو شہر میں رہتا تھا ایک پرچہ لکھا تھا جو اسکی جیب میں رکھا ہوا تھا۔ اتفاقاً یہ پرچہ اس کی جیب سے نکل پڑا۔ ۱۰ بجے کے قریب شمیم شیروانی پہن کر وہاں سے چلا گیا شکیلہ نے گرا ہوا پرچہ اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔ تنویر جب دفتر سے واپس آیا۔ شکیلہ نماز پڑھ رہی تھی۔ تنویر سیدھا شکیلہ کے کمرہ میں پہنچا۔ شمیم کی تصویر دیکھ کر اس کی بدگمانی کی آگ اور زیادہ مشتعل ہو گئی اس کے بعد تنویر کی نظر اس خط پر پڑ گئی خط کو دیکھ کر تنویر کی پیشانی کے تمام خط ابھر آئے اس کا جسم غصے سے کانپنے لگا۔ شکیلہ نماز پڑھ کر کمرہ میں آئی اور اس نے تنویر کو خنداں پیشانی کے ساتھ سلام کیا۔ تنویر پر بدگمانی کا بھوت سوار تھا۔ سلام کا جواب کیا دیتا شمیم کا خط شکیلہ کو دکھا کر بولا "اچھا اب خط و کتابت بھی ہونے لگی میرا تو پہلے ہی ماتھا ٹھنکا تھا۔ شکیلہ! مجھے تجھ سے ایسی امید نہ تھی" تنویر کی اس عجیب و غریب گفتگو سے شکیلہ کانپ اٹھی۔ اس نے پرچہ تنویر کے ہاتھ سے لے کر پڑھا جس میں شمیم نے اپنے کسی دوست کو لکھا تھا۔ "مائی ڈیر مجھے آپ کے یہاں آنے آج اور کل فرصت نہ ہوگی آپ کسی وقت خود ہی فرصت نکال کر آ جائیں تو بڑا کرم ہو گا"

خط پڑھنے کے بعد شکیلہ کا ذہن فوراً تنویر کی بدگمانی اور اس کے اسباب

موثرات کی طرف منتقل ہو گیا لیکن وہ اپنی صفائی آخر کس طرح پیش کرتی - ایک پاکدامن اور عفیفہ کے لئے بدگمانی سے زیادہ تکلیف دہ چیز اور کیا ہو سکتی ہے - خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ اپنی بے گناہی کے ثبوت میں وہ کوئی چیز پیش نہ کر سکے - شکیلہ کا دل بھر آیا وہ تنویر سے بے اختیارانہ طور پر لپٹ کر کہنے لگی -

"پیارے تنویر للہ! رحم کرو - کیا تم مجھ سے واقعی بدگمان ہو گئے ہو - اگر یہ بات صحیح ہے تو خدا کے لئے مجھے کونین کی رسوائی سے بچاؤ اور اپنی شکیلہ کا خاتمہ کر دو - میں حیران ہوں کہ تمہاری اس بدگمانی کو کس طرح دور کروں جس کے تصور سے میں اپنے مستقبل کو نہایت تاریک پاتی ہوں"

تنویر نے جھلا کر کہا - "میری بدگمانی بلاوجہ نہیں ہے شمیم کی تصویر کے انہماک کو یاد کرو - آہ! عورت کس قدر پُرفریب اور غیر مستقل فطرت کی حامل ہے اور ہاں پھر اس خط کو پڑھو"

شکیلہ جواب دینا چاہتی تھی، مگر اس کی زبان تھرانے لگی - اس کی قوت بیانیہ مسلول ہو گئی اس کا نطق مفلوج ہو گیا، وہ بے اختیار دھاڑیں مار کر رونے لگی - اس کی آنسو کی ہر بوند نے تنویر سے رحم کی درخواست کی - اس کے ہونٹوں کے ہزار تعاش نے بے گناہی کا افسانہ سنایا مگر تنویر کے حواس کو بدگمانی اور رقابت کے جذبات نے مختل کر دیا تھا اور اختلال حواس کے بعد وہ لطافت احساس کی دولت کھو چکا تھا وہ ایک زخمی شیر کی طرح بپھرا ہوا تھا - جس کو ٹوکنا ہمیشہ خطرناک ثابت ہوتا ہے -

شکیلہ کے باپ پر فالج کا خفیف حملہ ہوا تھا۔ ارشد بہن کو لینے کے لئے کلکتہ آیا۔ سوءِ اتفاق کہ وہ اسی شب کو کلکتہ پہنچا جس شب تنویر اور شکیلہ کے درمیان تنفر و بدگمانی کی عظیم الشان خلیج حائل ہو چکی تھی۔

سالے کو دیکھ کر تنویر کا غصہ کچھ اور تیز ہو گیا مگر اس نے بڑے ضبط سے کام لیا اور ارشد پر کچھ بھی ظاہر نہ ہونے دیا۔ صبح کو آٹھ بجے کلکتہ کو ٹرین جاتی تھی تنویر شب ہی کو ارشد سے اسٹیشن چلنے کی معذرت کر چکا تھا۔ ارشد بہن کو لے کر روانہ ہو گیا۔ شکیلہ کا شیشۂ دل تنویر کی بدگمانی کے پتھر سے چکنا چور ہو گیا تھا۔ باپ کی علالت کی خبر اس پر مستزاد تھی۔

شکیلہ کو فیض آباد پہنچے ہوئے دو دن ہوئے تھے کہ تنویر کا ٹائپ شدہ خط اس کو موصول ہوا جس میں درج تھا۔ "میں ابھی اس مسئلہ پر غور کر رہا ہوں کہ میرے اور تمہارے آئندہ تعلقات قائم رہ سکیں گے یا نہیں۔ میں نے چھ ماہ کی مدت اس غور و خوض کے لئے مقرر کی ہے۔ اس عرصہ تک میرا تم سے کوئی تعلق نہیں ہوگا"

تنویر کے خط نے شکیلہ کو نیم جان بنا دیا۔ معاملہ ایسا شدید تھا کہ گھر والوں سے بھی خود ذکر نہ کر سکتی تھی۔ شکیلہ کی طرف سے تنویر بہت بددل ہو گیا تھا۔ اب وہ محبت کی نئی شاہراہ کے لئے مضطرب تھا۔ "ش" کے خطوط کی یاد اس کے دل میں نئے سرے سے تازہ ہو گئی۔ اس نے ش کو ایک مفصل خط "خاک نشین" کی طرف سے لکھا جس کا جواب وہاں سے یہ آیا۔

" آپ کی محبت قابل قدر ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آئندہ آپ

کے خطوط کا جواب نہ دے سکوں گی کیونکہ میری محبت کا مرکز ایک
دوسری ہستی ہے اس عرصہ میں میری زندگی کو انقلابات کے مختلف
دور سے سابقہ پڑا اور ان دنوں میں ابتلاء و آزمائش کے شدید ترین
دور سے گذر رہی ہوں اور میری روح پر نزع کا عالم طاری ہے۔
لیکن ان تمام اندوہ آگیز حالات کے باوجود میرا دل مطمئن ہے
کیونکہ میرا ایقان ہے کہ آخر کار اخلاص محبت کی فتح ہوگی۔"

تنویر پر اس خط کا بیحد اثر ہوا۔ لیکن وہ بالکل نہ سمجھ سکا۔ اس کا ذہن بالکل
اس طرف منتقل نہیں ہوا۔ کہ "ش" کا خط اس کے حالات کا ترجمان ہے۔ "خاک
نشین" نے "ش" کو جواب میں لکھا "آپ کے خط میں اس قدر مبہم اشارات
ہیں کہ میں کچھ نہ سمجھ سکا خدا کے لئے صاف لکھئے کہ یہ کیا معمہ ہے کیا میری
ناچیز خدمات اس سلسلہ میں کام آسکتی ہیں۔"

شکیلہ اور تنویر کی مفارقت کو چھ ماہ سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا، اس عرصہ
میں تنویر کی بدگمانی کا جوش بھی ایک حد تک کم ہو گیا۔ ادھر خسر کے خط پر خط
طلبی کے لئے آرہے تھے۔ آخر تنویر سسرال روانہ ہو گیا۔ سسرال پہنچکر اس کو شکیلہ
کے کمرہ میں جگہ ملی۔ جس کا بڑا حصہ کتابوں کی الماریوں سے بھرا ہوا تھا۔ شکیلہ
کی میز بھی کتابوں سے پُر تھی۔ تنویر نے کھانے سے فارغ ہو کر میز کی کتابوں کو
اُلٹنا شروع کیا۔ تنویر کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس کا
"ش" کے نام سے بھیجا ہوا خط وہاں رکھا ہوا تھا۔ تنویر پر ایک عجیب عالم

طاری ہوگیا۔ اس نے خط کو بار بار پڑھا۔ پھر اس کو ہاتھ سے اس اطمینان کے لئے چھوا کہ کہیں نگاہیں تو دھوکا نہیں دے رہی ہیں۔ شب کو دس بجے کے قریب شکیلہ اپنے کمرہ میں آئی۔ شکیلہ اپنے کمرہ میں تو آگئی لیکن اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ تنویر کی بد گمانی کی اور اس کے غصہ کے منظر کے تصور سے اس کا قدم آگے نہ اٹھتا تھا وہ دبے پاؤں تنویر کے قریب آکھڑی ہوگئی۔ تنویر خط پڑھنے میں اس درجہ محو تھا کہ اس کو شکیلہ کے آنے کی مطلق خبر نہ ہوئی اس کے خط کو پڑھتے ہوئے حیرت کے لہجہ میں آہستہ آہستہ کہا۔ میرا ہی خط ہے۔ ہاں واقعی میرا ہی خط ہے یہاں کیسے

شکیلہ نے تنویر کے جملے پوری طرح سن لئے۔ اس کی غیر معمولی ذہانت پر تمام اسرار منکشف ہوگئے کہ تنویر وہی خاک نشیں ہے جس کے مضامین کی کسی زمانہ میں وہ شیدائی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا: ابھی ایک خط کو دیکھ کر ہی محو حیرت ہوئے جاتے ہیں۔ مجھ سے کہیئے تو آپ کے متعدد خطوط دکھا دوں۔ "خاک نشیں" کے مضامین نے تو میرے دل پر یہ اثر کیا تھا کہ یہ شخص صاحب تدبر اور روشن فکر ہوگا، مگر ہاں! بدگمانی لاعلاج مرض ہے۔

تنویر اس پر شکیلہ سے لپٹ کر کہنے لگا: ایں! تو "تم" ہی ہو، میں کتنا خوش قسمت ہوں! شکیلہ للہ مجھے معاف کرو، مجھے اپنی بے وجہ بدگمانی پر شدید ندامت ہے۔ میرے جرم کو خدارا بخش دو۔ میں نے قدرت کی بخشی ہوئی عظیم الشان دولت کو ٹھکرا دیا۔ میں نے محبت کی توہین کی۔

شکیلہ نے تنویر کو مسکرا کر گلے سے لگا کر کہا۔ آپ کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے

ہیں آپ اور جُرم! توبہ! عیاذاً باللہ۔ قدرت کو یہی منظور تھا۔ فی نفسہٖ ابتلا و
آزمائش کے بغیر محبت ادھوری رہ جاتی ہے۔ وہ محبت بہت ہی ناکامیاب ہے
جو ابتدا سے انتہا تک لبریز اطمینان و مسرت رہی ہو۔ ہاں یہ تو بتایئے کہ پردہ
پر جو مضمون آپ نے لکھا تھا اور اسی سلسلہ میں جو میں نے آپ سے مراسلت کی تھی
تو آپ مغرور کیوں ہو گئے تھے، اور ہاں "احساسِ محبت" والی نظم بھی آپ کو یاد ہے"
تنویر مسکرا دیا اور اس نے ندامت خیز نگاہوں کے ذریعہ سینکڑوں سہو کے
سجدے کر ڈالے۔

ایک رات

یو۔پی میں جاڑے کی راتیں عموماً سرد ہوتی ہیں۔ جس رات کا میں ذکر کر رہا ہوں اس رات کے ابتدائی حصہ میں خوب زور کی بارش ہوئی تھی۔ برفانی ہوائیں چل رہی تھیں جاڑے کے مارے ہاتھ پاؤں شل ہوئے جا رہے تھے اور تمام ماحول سردی کی شدت سے سکڑا جا رہا تھا۔ مجھے شب میں ایک بجے کی ٹرین سے علی گڑھ جانا تھا۔ اسٹیشن میرے مکان سے تین چار فرلانگ کے فاصلہ پر تھا۔ میں نے تھرڈ کلاس کے لئے سو جانے کی کوشش کی اور لحاف میں آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ لیکن اول تو ہواؤں کے سرد اور تیز جھونکے یورش کر رہے تھے۔ دوسرے ٹرین چھوٹ جانے کا دھڑکا

لگا ہوا تھا، اسلئے نیند نہ آئی تھی نہ آئی۔ بہت دیر تک کروٹیں بدلتا رہا وقت کاٹنے کے لئے! مگر انتظار کی گھڑیاں بے چینی کی کروٹوں سے شاید اور زیادہ لمبی ہو جاتی ہیں۔ بارہ بجے سے قبل ہی ہمت کر کے اٹھا، کھونٹی پر ٹنگی ہوئی شیروانی کو پہنا۔ جو خنک ہواؤں کے چھونے سے اولے کی طرح ٹھنڈی تھی، اس کے بعد خوب موٹے سے کمبل میں اپنے جسم کو اچھی طرح لپیٹ کر مکان سے روانہ ہو گیا۔

گاؤں کی ناہموار گلیاں مینہ برسنے سے اور زیادہ تکلیف دہ ہو گئی تھیں وہ تو یہ کہیئے کہ ان گلیوں کے نشیب و فراز سے میرے پاؤں آشنا تھے، ورنہ راستہ اس درجہ خراب بلکہ ناقابل گذر بن گیا تھا کہ مجھے نہ معلوم کتنی قلابازیاں کھانی پڑتیں کہیں اونچا، کہیں نیچا، پھسلنی مٹی، تنگ گلیاں اور مستزاد گھٹا ٹوپ اندھیرا! بس میں صحیح وادیٔ ظلمات سے گذر رہا تھا۔ وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے کہ۔

؎ رہروِ راہ محبت کا خدا حافظ ہے!

اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

تو مجھے واقعی دو چار سخت مقاموں سے واسطہ پڑا اور اگر دیوار دل کا سہارا نہ مل جاتا تو یقین جانیئے کہ میرے ہلکے پھلکے جسم کو "خطِ منحنی" یا کم سے کم "زاویہ قائمہ" کی شکل اختیار کرنی پڑتی

رات، شاعروں کی "شب دیجور" اور عاشقوں کی "فرقت کی رات" سے بھی زیادہ اندھیری اور بھیانک تھی ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، کہیں کہیں پرنالے سے دھیرے دھیرے پانی ضرور ٹپک رہا تھا اور کبھی کبھی گاؤں کے کتے اپنی کرخت

آوازوں سے اس سکوت کو توڑ دیتے تھے۔ میں دو تین گلیوں سے گذر کر برہمنوں کی
گلی میں پہنچا جو تنگی اور ناہمواری میں آپ اپنی مثال تھی۔ اس گلی کے بیچ میں پیپل
کا تناور درخت تھا جس کے متعلق گاؤں کے لوگوں میں طرح طرح کی باتیں مشہور تھیں،
کوئی کہتا تھا کہ اس پیپل کے نیچے بڑے بڑے دانتوں والی چڑیل رہتی ہے۔ کسی کا کہنا
تھا کہ اس پیڑ پر آسیب کا سایہ ہے۔ ایک چھلاوہ رہتا ہے جو کبھی چھوٹا ہو کر بکری
کا بچہ بن جاتا ہے اور جب پھیلنا شروع ہو گیا ہے تو اس کا سر آسمان سے لگ جاتا ہے
بعضوں کا خیال تھا کہ برہمن پوری میں جو اندھی برہمنی رہتی تھی اور جسے چوروں نے مار
ڈالا تھا۔ اسکی روح کا پیپل پر قبضہ ہے، جو رات میں راہگیروں کو ستاتی ہے۔

بھیانک رات، گھپ اندھیرا، خوفناک سناٹا، اس گلی کے نکڑ پر پہنچکر میرے
پیر یکایک بوجھل ہو گئے اور میرے حافظے نے ذرا سی دیر میں ان افواہوں کے ورق
الٹ دیئے جو گاؤں والوں میں پیپل کے متعلق پھیلی ہوئی تھیں۔ مجھے جتنی دعائیں
بھی یاد تھیں وہ سب کی سب پڑھ ڈالیں نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ! لیکن
خوف کچھ اس بُری طرح طاری ہوا تھا کہ ان دعاؤں سے بھی دل نہ تھما اور خوف بدستور
باقی رہا۔ میں دل ہی دل میں اپنے کو ملامت کر رہا تھا کہ مجھے اول تو لاٹھی لے
کر گھر سے نکلنا تھا۔ کیونکہ بڑے بوڑھوں کی کہاوت ہے کہ ماں جایا بھائی اور
ہاتھ کی لاٹھی وقت پر کام آتے ہیں۔ اور مجھے پاک کپڑے پہن کر اور وضو کر کے
اسٹیشن کا قصد کرنا تھا، کیونکہ اگر چھلاوے اور بھوت سے ٹکر ہو گئی اور نصیب
دشمناں ہم ختم ہو گئے تو عاقبت خراب ہو جائے گی۔ بے وضو روح کو کون قبول

کرے گا اور ناپاک بدن کی ہڈیوں اور پسلیوں کے ساتھ نہ جانے قبر کا کیا سلوک اور برتاؤ ہو
وہ جو غالب نے کہا ہے کہ:۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال

تو میں واقعی "بجائے خود" "محشر توہمات" اور "قیامتِ خوف" بنا ہوا۔ گلی کے نکڑ پر
اس طرح کھڑا تھا کہ جیسے کسی غیر معمولی خطرے کے اچانک ظہور کا مجھے انتظار ہے
میں نے ہمت کر کے زاویۂ خیال کو بدلا، اور دل ہی دل میں اپنے اسلاف اور
بزرگوں کے کارنامے یاد کرنے لگا اور اس مردانہ تصور کے بعد میں اس منزل میں آگیا
تھا جہاں مردی اور نامردی میں مشکل سے ایک قدم کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ میں نے جی
کڑا کر کے قدم بڑھایا اور خوف دور کرنے کے لئے اس غزل کا مطلع گنگنانے لگا جسے
حال ہی میں ایک طوائف نے گاؤں کی ایک شادی میں گایا تھا شعر یہ تھا۔

نہ چھیڑو ہمیں ہم ستائے ہوئے ہیں
جدائی کے صدمے اٹھائے ہوئے ہیں

پیپل کے قریب پہنچکر ہمت نے پھر جواب دے دیا اور دل زور زور سے
دھڑکنے لگا۔ مجھے یاد نہیں کہ غزل کے اشعار حافظہ سے محو ہو گئے یا زبان پڑھتے
پڑھتے خود بخود رک گئی، بہر حال پیپل کے قریب پہنچکر میں بالکل خاموش ہو گیا اور
سوچنے لگا کہ اگر کسی خبیث روح سے مقابلہ ہو گا تو میں کیا کروں گا، معاً خیال آیا
کہ بھاگ جاؤں گا۔ مگر دوسرے خیال نے فوراً اس خیال کی تردید کر دی کہ دانتوں والی
چڑیل کو دیکھ کر پاؤں اٹھ بھی سکیں گے! میں نے اس کے بعد فوراً جیب کو ٹٹولا اور

چاقو پا کر ذرا اطمینان سا محسوس ہوا کہ اگر چھلاوے سے مڈھ بھیڑ ہو گئی تو یہ حسین
چاقو جسے خریدے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا اور جس کی دھار بھی میلی نہیں ہوئی چھلاوے
کے پیٹ میں جھونک دیں گے۔ مگر فوراً ہی خیال آیا کہ چھلاوے کا بدن گوشت، پوست
سے بنا ہوا تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ چھلاوہ تو ایک جسم ہوا کا نام ہے۔ چاقو لاکھ تیز سہی مگر
ہوا کے بنے ہوئے بدن کا چاقو کی دھار کیا بگاڑ سکتی ہے! پھر خیال آیا کہ مفر کی
بس ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ ذرا اوپر کی صورت کو دیکھ کر ہم زمین پر کمبل اوڑھ کر
لیٹ جائیں اور ہو سکا تو چلانا شروع کر دیں گے۔ ابھی اس خیال کی تردید کے لئے دوسرے
خیال نے پوری طرح کروٹ بھی نہ لی تھی کہ ہواؤں کے زور سے پیپل کی ڈالیاں زور زور
سے ہلنے لگیں۔ ڈالیوں کا ہلنا تھا کہ مجھے پسینہ آ گیا۔ اور دل میں نہایت تیز دھک
دھک ہونے لگی۔ میرا دل خود بخود بیٹھا جاتا تھا اور میرا ذہن محسوس کر رہا تھا کہ
کوئی چیز پیپل سے نیچے اتر رہی ہے!

خوف کے ساتھ غیرت کا جذبہ بھی ہلکے ہلکے ابھر رہا تھا اور اس جذبہ کی پیدائش
ان گاؤں والوں کے ان عجیب و غریب تجربات کا اثر تھا کہ بھوت اور چڑیل کو دیکھ
کوئی شخص ہمت کر کے گالیاں دینا شروع کر دے تو بعض وقت یہ خبیث روحیں
پیچھا نہیں کرتیں میں نے بھی جی کڑا کر کے کہنا شروع کیا۔

"ابے مردود! اگر تیرے اندر دم ہے تو آگے آ! مرد ہوں مرد! کیا مجھے کوئی بالک بچہ
سمجھا ہے؟

اور ہاں! دوست ہوشیار رہنا کہ جس کا چاقو ہاتھ میں لگا ہوا ہے قسم خدا کی

.... پرخچے اُڑا دوں گا۔

ہم کسی کے باپ سے بھی ڈرنے والے نہیں ... خدا کا کلام ہمارے سینہ میں محفوظ ہے

میں اپنے خود تراشیدہ غنیم کو چیلنج دے ہی رہا تھا کہ گاؤں کے چوکیدار نے

بہت ہی قریب سے آواز دی۔

جاگتے رہنا! بھائیو! خبردار رہنا۔

چوکیدار کیا تھا میرے لئے تو فرشتہ غیبی تھا۔ میں نے خود ہی بڑھ کر کہا۔

.. میاں چاند خاں! السلام علیکم۔

چوکیدار نے جواب دیا۔

وعلیکم السلام! شیخ جی!

چوکیدار کو کھانسی آئی ۔ وہ کھانسنے لگا۔ اور میں اتنی دیر میں لمبی لمبی ڈگیں بھرتا

ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

شیخ جی! یہاں برہمن پوری میں کیسے کھڑے ہو۔ چوکیدار نے دریافت کیا۔

۔ بھئی میں اسٹیشن جا رہا ہوں ایک بجے کی ایکسپریس ہے۔

مجھے علی گڑھ جانا ہے، میرا پیر کیچڑ میں دھنس گیا تھا، اسلئے رُک جانا پڑا۔

میں نے جواب دیا۔

۔ میاں! کوئی بیڑی ویڑی ہے تمہارے پاس! چوکیدار نے کہا۔

میرا خوف تو جاتا رہا تھا، لیکن پھر بھی اسٹیشن تک تنہا جاتے ہوئے دل ہچکچاتا

تھا۔ اس لئے چوکیدار سے میں نے کہا :۔

بھئی بیڑی تو میرے پاس نہیں ہے، چلو اسٹیشن چلو وہاں پنواڑی سے تم کو سگریٹ کی ڈبی دلوا دوں گا۔

چوکیدار فوراً تیار ہو گیا اور ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے اسٹیشن پہنچے۔ میں نے فوراً اپنا وعدہ وفا کیا۔ پنواڑی کی دوکان سے رڈ چھاپ (Red Lamp) کی ایک ڈبی خرید کر چوکیدار کو دی۔ اور چوکیدار سگریٹ پیتا ہوا، گاؤں کو واپس ہو گیا۔

ابھی گاڑی کے آنے میں دیر تھی۔ مسافر موٹے موٹے لحافوں میں لپٹے ہوئے خراٹے بھر رہے تھے اور اسٹیشن کے کتے بھی مسافروں کے ساتھ لحافوں میں لپٹ کر اس طرح سو گئے تھے جیسے یہ مسافروں کے بڑے ہی گاڑھے دوست ہیں! اسٹیشن پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایک دو مسافر، پہریدار، پنواڑی اور ریلوے میل سروس کا ملازم بس یہ چند ذی روح جاگ رہے تھے۔ ڈاک خانہ کا ملازم چھینٹ کی رضائی میں لپٹا ہوا اس زور شور کے ساتھ سگریٹ پی رہا تھا گویا اٹلی نے حبشہ کے کسی نامعلوم مقام پر گیس کا تھیلا غلطی سے کھلا چھوڑ دیا ہے اور گیس بھک بھک نکل رہی ہے۔ تیسرے درجہ کے مسافرخانہ کی بنچ پر ایک فربہ جسم کا مہاجن نیند میں بڑبڑا رہا تھا۔

"اجی ہنیم جی میں روپیہ سیکڑے کا بیاج لگا دو۔
سونے کا بھاؤ بہت اتر گیا ہے۔
پھر میں شکر نہیں گڑ ڈالا جائے گا۔"

ایک بجنے میں چند منٹ باقی تھے کہ لائن کلیر کی گھنٹی بجی۔ مسافر ہڑبڑا کر اٹھے

ٹکٹ خرید لئے گئے اور آن کی آن میں ٹرین برفانی فضا کو چاک کرتی ہوئی آگئی، اور میں تیسرے درجہ کے ایک ڈبہ میں گھس گیا پھرتی کے ساتھ! میں ابھی بیٹھنے کے لئے جگہ ٹٹول ہی رہا تھا کہ ریل نے سیٹی دی اور جھک جھک کرتی ہوئی چلنے لگی۔ ڈبہ میں آدمی تو زیادہ نہ تھے، لیکن تمام نشستیں گھری ہوئی تھیں اور مسافر اس اطمینان و فراغت کے ساتھ سو رہے تھے۔ گویا کہ ڈبہ انہوں نے ریزرو (Reserve) ہی نہیں کیا بلکہ خرید لیا ہے۔ میں نے دو چار مسافروں کو ٹھوکا دیا کہ۔ بھئی! ہمیں بھی تھوڑی سی جگہ دو۔ آخر ہم نے بھی تو کرایہ دیا ہے۔" مگر وہ نیند کے مارے دو چار دفعہ "اونہہ" کہہ کر رہ گئے اب مجھے غصہ آنا شروع ہوا ماہرین علم النفس کا فیصلہ ہے کہ چہرہ غصہ اور شرم دونوں حالتوں میں سرخ ہو جاتا ہے مگر محبت کی سرخی ماتھے سے پیشانی کی سرخی کان اور رخسار سے اور غصہ کی سرخی کا آغاز آنکھ سے ہوتا ہے تو میری آنکھیں بھی غصہ سے لال ہو گئیں۔ لیکن خدا میری "عقل" کو کبھی جذبات کی طرح "جوان" نہ بنائے آڑے آگئی اور میں نے سوچا کہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں علی گڑھ آجائے گا۔ اتنی سی دیر کے لئے کسی سے لڑائی مول لینا ٹھیک نہیں! میں نے دیکھا کہ ڈبہ کے شرقی حصہ میں ایک سیٹ پر ذرا سی گنجائش ہے۔ لہٰذا میں وہاں تھوڑی سی جگہ پر سکڑ کر بیٹھ گیا اور جاڑے میں سکڑنا برا بھی معلوم نہیں ہوتا۔

میرے قریب کا مسافر نہایت ہی بھڑکیلی قسم کی رضائی میں لپٹا ہوا سو رہا تھا اس کی رضائی کو جنبش ہوئی اور میرے کانوں نے چوڑیوں اور جھانجنوں کی آواز سنی آپ خواہ مجھ کو پرلے درجہ کا بدمعاش سمجھیں یا انتہائی آوارہ لیکن سچ یہ ہے کہ چوڑیوں

کی آواز سے کانوں میں رس پڑنے لگا، میرا سامعہ ابھی پوری طرح پر لطف اندوز بھی نہ ہونے پایا تھا کہ وہی ساغر شربت ورد کے ساتھ انگڑائی لے کر اٹھا اور جب اس نے رضائی سے منہ نکالا تب تو میں حیران رہ گیا! بہت کھلتا ہوا رنگ، کتابی چہرہ، نیم باز آنکھیں، گھنی زلفیں! عورت کی آنکھوں کا سرمہ پھیل گیا تھا اور ہونٹوں پر پان کی لالی بہت نیچے تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے مجھے سلام کیا اس طرح کہ اپنی حنائی انگلیوں کو ماتھے پر رکھ دیا۔ عورت کے اتنے سے اقدام نے دل و دماغ کا نقشہ ہی بدل دیا اور ایسا محسوس ہونے لگا گویا قیس و فرہاد کی روحیں بیک وقت آ کر میرے جسم میں داخل ہو گئی ہیں اور داخل نہیں ہوئیں تو میری امداد ضرور کر رہی ہیں۔ میں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ سلام کا جواب دینے کی کوشش کی لیکن بدحواسی کا برا ہو کہ زبان سے "وعلیکم السلام" نکل گیا۔ مجھے اس جواب پر بڑی ندامت ہوئی کہ وعلیکم السلام سن کر اس مہذب قسم کی عورت نے مجھ کو یقیناً مولوی اور مولانا سمجھا ہوگا۔ مگر اب پچھتانے سے کیا ہوتا تھا، تیر کمان سے چھوٹ چکا تھا۔

عورت نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

- استاد جی کیا گھوڑے بیچ کر سوئے ہو ذرا کروٹ بھی نہیں بدلتے۔

عورت کے "استاد جی" کہنے پر کان کھڑے ہوئے کہ یہ تو کوئی طوائف معلوم ہوتی ہے۔ امیدوں اور تمناؤں کا جو قلعہ چند منٹ میں تیار کیا تھا بنتے ہی گر گیا۔

- آپ کہاں سے آ رہی ہیں..... میں نے دریافت کیا۔

میں بریلی سے آرہی ہوں، وہاں ایک سیٹھ کے یہاں شادی میں گئی تھی میرا نام مشتری ہے، علی گڑھ کے مضافات میں رہتی ہوں۔ طوائف ہلکی سی انگڑائی لیتے ہوئے بولی۔

علی گڑھ اسٹیشن کے آنے میں پون گھنٹہ تھا میں نے سوچا کہ آؤ وقت گذاری کے لئے اسی سے باتیں کریں، پہلے تو ہم نے اس کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ہم ہندوستان کے بہت بڑے شاعر ہیں اور ہمارے کلام کی ہندوستان میں دھوم مچی ہوئی ہے۔ ہماری غزلیں اگر تم گاؤ گی تو تمہاری بہت شہرت ہوگی، ہماری اس گفتگو کو طوائف نے زیادہ توجہ کے ساتھ نہیں سنا اور ہم نے یہ رنگ دیکھ کر فوراً موضوع بدل دیا، ہم نے اس سے کہا ہمارے چچا کے یہاں دو طوائفیں ملازم ہیں اور ہمارے ماموں گانا سننے کے بہت ہی شوقین ہیں۔ ہم نے اسے باور کرانے کی کوشش کی کہ ہمارا خاندان "طوائف نواز" ہے۔ اور ہم اسی خاندان دادا کے چشم و چراغ ہیں۔ اس گفتگو کو اس نے توجہ کے ساتھ سنا اور ایک لفیس اور سبک گلوری ہم کو بنا کر دی۔ دوپٹہ کا پلو سر سے قصداً ڈھلکاتے ہوئے! اب ہم اور وہ بہت ہی گھل مل کر باتیں کرنے لگے۔ وہ اپنے ناز و انداز کے تیر ہماری طرف پھینکتی رہی۔ ہم ہر ناوک کو شکریہ کے ساتھ واپس کرتے رہے۔ کیونکہ یہاں تو صرف ذرا سی دل لگی اور جی کا بہلانا مقصود تھا۔

تھوڑی دیر میں علی گڑھ اسٹیشن آگیا۔ ٹرین پلیٹ فارم پر ٹھہری اور ہم دروازہ کھول کر پلیٹ فارم پر اتر گئے۔ طوائف کے ساتھی بوڑھے (استاد جی نے) ہماری

طرف دیکھتے ہوئے طائف نے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا۔

"کیا شکار پھنس گیا۔"

طائف مسکرائی۔ گویا اس کی مسکراہٹ "اثبات" کی دلیل تھی۔ ہم دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے پلیٹ فارم سے باہر آئے اس تصویر کے ساتھ کہ۔

"فریب دینے والے بھی "فریب کا شکار ہو جاتے ہیں"

کرایہ کا تانگہ کر کے وہاں پہنچ گئے جہاں کے لئے آئے تھے۔

مردوں کے متعلق ایک عورت کا تجربہ

فریبِ محبت کی رنگین مگر عبرت انگیز داستان

عورت کی ڈائری کا ایک ورق ذیل میں پیش کیا جاتا ہے جس سے مردوں کے متعلق اس کے ذاتی تجربات کا اندازہ ہو سکتا ہے:۔

میں "شام پین" کے انگوری باغیچوں میں بیٹھ کر یہ سطریں سپردِ قلم کر رہی ہوں، ہرے بھرے کھیت میری نظروں کے سامنے لہلہا رہے ہیں۔ انگور کے شاداب خوشے شراب بننے کی دعوت دے رہے ہیں۔ میں اپنی کتابِ زندگی کے اوراق جلد جلد الٹ دینا چاہتی ہوں، اور یہاں جو کچھ لکھا جا رہا ہے، وہ افسانہ نہیں حقیقت ہے... ایسی حقیقت جس میں میری تمناؤں کا خون ملا ہوا ہے۔

میں فرانس کے ایک چھوٹے سے قصبہ کی رہنے والی ہوں۔ میرے والد فوج میں سارجنٹ تھے اور میرے ماموں کاشت کاری کرتے تھے۔ میں اپنے ماموں کے پاس ہی گاؤں میں رہا کرتی تھی۔ مجھے بچپن کی تمام باتیں ایک ایک کر کے یاد ہیں۔ میرا ماموں زاد بھائی کس شوق کے ساتھ بنفشہ کے پھولوں کے ہار مجھے پہنایا کرتا تھا۔ اور میری گردن میں ہار ڈالتے وقت کہا کرتا تھا۔ "بہن! تم بنفشہ کا ہار پہن کر اور زیادہ حسین ہو جاتی ہو۔" میں اس کمسنی میں جذبات جنسی سے یکسر آشنا تھی۔ لیکن بھائی کے اس کہنے پر میری آنکھیں بار حیا سے خود بخود جھک جاتیں اور میرے رخساروں میں شرم کی سرخی دوڑ جاتی۔ ایک دفعہ میں اور میرے ماموں زاد بھائی نے شلجم اور گوبھی کے ڈھیروں پر گھوڑوں کو کھول کر چھوڑ دیا۔ گھوڑوں نے ذرا سی دیر میں ترکاری کو خراب کر دیا۔ ماموں نے اس پر ہم دونوں کو سزا دی۔ ان کی خفگیں نگاہیں مجھے ابھی تک یاد ہیں۔

میری صحت بچپن ہی سے اچھی تھی۔ گاؤں کی فضا نے اس صحت کو اور چار چاند لگا دیئے۔ میرا آٹھواں غضب کا اٹھان تھا۔ میں عشق پیچاں کی بیل کی طرح بڑھنے لگی اور اپنی ہمجولیوں سے بہت پہلے جوان ہو گئی۔ میں خود ستائی کے خوف سے حقیقت کو نہیں چھپا سکتی، جب کہنے پر آئی ہوں، تو کوئی بات چھپا نہ رکھوں گی ہاں! تو میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں گاؤں کی سب سے زیادہ خوبصورت لڑکی تھی۔ اور میرا حسن گاؤں والوں میں "مثال اور نظیر" کی حیثیت رکھتا تھا۔ مجھے اب تک اپنے رخساروں کی سرخی یاد ہے۔ رخسار کاہے کو تھے، سرخ انار تھے، بلکہ دہکتے

ہوئے انگارے! کاش! زمانہ کا بے رحم ہاتھ میرے رخساروں سے سُرخی نہ چھین لیتا۔

میرے ماموں کے مکان سے تھوڑی دُور کے فاصلہ پر ایک زمیندار کا مکان تھا۔ جس کا لڑکا "فریزر" ہمارے یہاں آیا جایا کرتا تھا۔ فریزر مجھ سے عمر میں کوئی چار پانچ سال بڑا ہوگا۔ لانبا قد، چھریرا بدن۔ کرنجی آنکھیں، شوخ و طرار اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خوش مزاج اور بذلہ سنج! فریزر مجھ سے گھنٹوں باتیں کرتا۔ پرانے زمانہ کے قصے دہراتا۔ اشعار گاتا، نقلیں کرتا اور باغیچوں کی روشوں پر ہنس ہنس کر ناچتا مجھے اسکی باتوں سے دلچسپی ہوگئی تھی، لیکن اس دلچسپی میں جذبات کو ذرا بھی دخل نہ تھا ایک دن ہم دونوں ناشپاتی کے باغیچہ میں ٹہل رہے تھے۔ میں گنگناتے ہوئے ناشپاتی کی ڈالی کو جھکا کر ناشپاتی توڑ رہی تھی کہ فریزر نے میرے پاس آکر میرے رخسار کو ٹھوکا دیتے ہوئے کہا:۔

"تم تکلیف کیوں کرتی ہو، لاؤ میں ناشپاتی توڑ دوں"

فریزر کی یہ حرکت مجھے ناگوار معلوم ہوئی، زندگی میں پہلی مرتبہ اس انداز کے ساتھ میرے بدن کو چھوا گیا تھا۔ فریزر نے آج بہت سے عشقیہ افسانے سنا ڈالے، ان افسانوں میں عورتوں اور مردوں کی محبت اور ہوس کاری کے واقعات تھے۔ پہلے تو میں نے ان افسانوں کو حیرت و دلفرت کے ساتھ سُنا۔ مگر فریزر کی چرب زبانی کی بدولت ان افسانوی چٹخاروں میں مجھے بھی لطف سا آنے لگا۔ جب ہم ناشپاتی کے باغیچہ سے مکان کو واپس ہوئے ہیں۔ تو شام ہو چکی تھی، اور گڈریئے اپنی بھیڑوں کے گلوں کو گاؤں کی طرف تیزی کے ساتھ ہانک کر لیجا رہے تھے۔

شب کو مجھے نیند ذرا دیر میں آئی - میں دن کے واقعات کو دل ہی دل میں دہراتی رہی، میری آنکھ اس وقت کھلی جب کہ دھوپ اچھی طرح پھیل چکی تھی اور محکمۂ زراعت کا لیکچرار، گلی کے نکڑ پر کھڑا ہوا، زور زور سے تقریر کر رہا تھا - اور دیہاتی دلچسپی کے ساتھ اس کی تقریر سُن رہے تھے -

آج فرزند بہت سویرے ہمارے یہاں آگیا اور باغ چلنے کا تقاضا کیا، ہم دونوں نہر کے کنارے باغ میں جا کر بیٹھ گئے - فرزند بہت دیر تک بانسری پر گاتا رہا - بادلوں کے نمناک ٹکڑے فضا میں تیر رہے تھے، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، اس پر بانسری کے نغمے، میں بہت زیادہ متاثر ہو رہی تھی - میں نے فرزند کی لے نوازی کی ایک مرتبہ لطف لے کر جو تعریف کی تو اس نے جھپٹ کر میرا منہ چوم لیا -

"یہ کیا کرتے ہو فرزند!" میں نے جھنجلا کر کہا -

"محبت، عشق، جذبات کی ترجمانی" فرزند میری طرف بڑھتے ہوئے بولا -

فرزند کی اس حرکت نے میرے بدن میں سنسنی پیدا کر دی، میرے سازِ جذبات کے پردے ایک ساتھ چھڑ گئے - میں اپنے کو کھویا ہوا سا محسوس کر رہی تھی - فرزند بڑا تجربہ کار اور ہوشیار تھا - وہ میری اس بے چینی اور لطف اندوزی کو سمجھ رہا تھا - اس نے پھر اسی حرکت کا اعادہ کیا - اور اب میں بالکل بے قابو ہو گئی - میں ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے کسی نے میرے بدن کے ہر رونگٹے کو شراب پلا دی ہے، اور مجھے مہینوں میں جا کر ہوش آئے گا -

ہم چند گھنٹوں کے بعد مکان واپس آئے ہیں - دوسرے دن ایک عزیز کی

شادی میں شرکت کے لئے دوسرے گاؤں چلی گئی، تین دن کے بعد واپس ہوئی تو فریزر نے شکایتوں کے دفتر کھول ڈالے، اور آنے کے بعد پھر وہی باغیچہ، سیر، تفریح نے نوازی ہریالی اور فریزر اور میں!

فریزر تجربہ کار تھا اور میں اس منزل سے یکسر نا آشنا۔ میں جنسی میلانات سے بالکل ناواقف تھی۔ فریزر نے بہت سے شاعروں، بادشاہوں اور امیروں کے افسانے سنا کر میرے دل میں یہ بات بٹھا دی کہ محبت ان ہی چٹخاروں کا نام ہے اور تمام دنیا محبت لطف لینے کے لئے ہی کرتی ہے۔ اس کی باتوں کا جادو آہستہ آہستہ مجھ پر اپنا کام کر رہا تھا۔ ہوس کاری اور معصیت کا درس دینے کے بعد اس نے میری طرف بڑھنا شروع کیا، میں اب اپنے قابو سے باہر ہو چکی تھی، کئی دن کی ہم جلیسی اور ہم نشینی کے بعد فریزر اور میں دونوں بے تکلف ہو گئے۔ میں ہوس کے چٹخاروں میں اتنی غرق تھی کہ دوشیزگی برقرار کرنے کا بھی خیال نہ رہا، اب میں زندگی کی اس منزل میں تھی جہاں معصیت کا احساس بھی باقی نہیں رہتا جذبات اور صرف جذبات میرا اوڑھنا بچھونا تھے میں سمجھتی تھی اور ہاں سمجھتی کیا تھی۔ فریزر نے میرے دل میں یہ بات اتار دی تھی کہ آدمی صرف ان ہی چٹخاروں اور لذتوں کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ سنسنی دھڑکن، کپکپی اور انگڑائی میری کتاب شباب کے عنوان تھے اور میں جذبات کی رو میں بہ رہی تھی۔

فریزر نے مجھ سے بارہا قسمیں کھا کھا کر کہا۔

"میں صرف تم سے محبت کرتا ہوں، تم میری جان ہو، میرا ایمان ہو، میری

زندگی تمہارے ہی رحم و کرم پر منحصر ہے۔ میں تم کو اپنا معبود سمجھتا ہوں، تم ہی میری سب کچھ ہو.....!

مجھے یقین ہو گیا تھا کہ فریند مجھ سے محبت کرتا ہے اور وہ میرا اور صرف میرا ہے۔ میں اور فریند اب تنہائیوں سے لطف اٹھانے لگے۔ کئی مہینے یہ صحبت گرم رہی، مگر کچھ دن کے بعد فریند کے آنے جانے میں کمی ہو گئی۔ میں نے کم آنے کا سبب پوچھا تو اس نے کہہ دیا کہ زمینداری کا کاروبار اس سے متعلق ہو گیا۔ اب فریند تنہائی میں پہلے کی طرح شوق و بےتابی کے ساتھ مجھ سے نہ ملتا۔ اس کی دلچسپیاں آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھیں اور میں اس کے بدلے ہوئے انداز کو گہری نظروں سے مطالعہ کر رہی تھی۔

فریند مسلسل چھ دن تک ہمارے یہاں نہ آیا۔ میں اس کے مکان پر پہنچی تو معلوم ہوا کہ فریند اپنے انگور کے باغ میں کسی کام سے گیا ہے۔ اس کا باغ گاؤں سے کوئی نصف میل کے فاصلہ پر تھا۔ میں اس کے باغ کی طرف روانہ ہوئی۔ راستہ میں مجھے چند کاغذ کے ٹکڑے ملے۔ میں نے ٹکڑوں کو اٹھا کر پڑھا، یہ میرے خطوط تھے، جو میں نے فریند کو لکھے تھے۔ مجھے اپنے خطوط کی اس پامالی کا بے حد رنج ہوا۔ میں باغ کی منڈیر کے قریب سے گزر رہی تھی کہ مرد اور عورت کی بات چیت کی آواز میرے کان میں آئی۔ میں باغ کے دروازے سے دبے پاؤں انگور کی بیلوں کی آڑ سے اس طرف پہنچی، جس طرف سے آواز آ رہی تھی۔ میں نے کیا دیکھا؟ اس منظر کو کس طرح الفاظ میں بیان کروں۔ اس منظر کو کاغذ پر پیش کرتے ہوئے اب بھی میرا خون کھول رہا ہے۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے گاؤں کی ایک نوجوان لڑکی

فریزر کے ہاتھ میں ہیں اور وہ لڑکی سے کہہ رہا ہے :-

"میں دُنیا میں صرف تم سے محبت کرتا ہوں، تم کتنی حسین ہو، گلاب اور نیفر
سے بھی زیادہ حسین! ذرا ہونٹوں کو میری طرف جھکا دو"

میری آنکھوں کے تلے اندھیرا چھا گیا ۔ وہی فریزر جو ہر وقت میری نگاہوں
میں حسن و محبت بن کر بسا رہتا تھا مجھے خونیں جلاد نظر آنے لگا ۔ فریب کار، ر
معصیت اور سیاہ کاری کا مبلغ! جس نے فریب دے کر، میری سب سے زیادہ قیمتی
چیز مجھ سے چھین لی تھی ۔ میں باغ سے الٹے پاؤں گھر کو واپس ہوگئی ۔ اور یہ داستان
اسی پر ختم ہوگئی ۔

دوسری ٹھوکر ۔ مجھے وہ گاؤں جہاں مجھے لوٹا گیا تھا ۔ برباد کیا گیا تھا ، بھیانک
معلوم ہونے لگا ، انگور کے باغچوں سے مجھے اب کوئی دلچسپی نہ رہی ، چند دن کے
بعد میرے والد رخصت لے کر آئے اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے ہیں ۔ ان کے ساتھ
خوشی خوشی چلی گئی ۔ گاؤں چھٹنے کا مجھ پر اثر کیا ہوتا ۔ میں تو خود اسے چاہتی تھی کہ اس
منحوس گاؤں سے کسی طرح میرا پنڈ چھوٹ جائے ۔ میرے والد ایک فوجی کوارٹر میں
رہتے تھے ۔ مکان زیادہ بڑا تو نہ تھا ۔ مگر عمارت قرینہ کی بنی ہوئی تھی ، اور ہم کو اس
میں کوئی تکلیف نہ ہوتی تھی ، ہاں ، گاؤں کے مکان کے صحن کی برابر صحن نہ تھا ، لیکن
دوسری خوبیوں نے اس کسر کو پورا کر دیا تھا ۔

میرے والد فوج میں بہت زیادہ مقبول تھے ۔ اکثر لوگ ہمارے یہاں آیا
جایا کرتے تھے ۔ فوج کا ایک نوجوان سارجنٹ بھی ہمارے یہاں آتا تھا ۔ اس کو تصویر کشی

کا بہت شوق تھا۔ اس نے میری بہت سی تصویریں کھینچ کر مجھے دیں، ایک دن اس نے مجھے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی، میں اس کے ہاں گئی، اس نے اپنا خاص کمرہ مجھے دکھلایا جس میں ہر طرف میری ہی تصویریں لگی ہوئی تھیں، اور ایک سادہ بنی ہوئی تصویر اس کی میز پر رکھی تھی، میں اپنی اتنی بہت سی تصویروں کو دیکھ کر خوش ہو گئی، اور اس بات کا مجھے یقین ہو گیا کہ یہ نوجوان مجھے قدر و محبت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ نوجوان نے باتوں باتوں میں مجھ سے کہا۔

"تمہاری صورت میں ایک خاص جاذبیت ہے، تمہارا بھولا پن کیمرے میں آ کر جادو بن جاتا ہے، تمہارا ہر پوز (Pose) بہترین ہے۔ یہ جو میں تمہاری تصویر کو (Enlarge) کر رہا ہوں جب تیار ہو جائے گی تو اس کو دیکھ کر تمہیں معلوم ہوگا کہ تم کیا ہو۔ ابھی میں نے تمہارے رخساروں میں تو رنگ نہیں بھرا، اس کے بعد ہونٹوں کی باری آئے گی:"

اس نوجوان کی باتوں سے میرے کانوں میں رس پڑنے لگا اور سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بہت دن تک اس نے اپنے کسی جذبہ اور خواہش کا اظہار نہیں کیا، کئی مہینے اسی طرح گذر گئے۔ میں اس کی طرف مائل ہو چکی تھی۔ اس کی باتوں نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ وہ مجھ کو چاہتا ہے اور اس کے چاہنے میں بناوٹ کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ گاؤں کی محبت کے فریب کو میں بھول گئی، اس نوجوان سے بھی کچھ دن کے بعد بے تکلفی ہو گئی، اور اس کو بھی میں نے جذبات کا پجاری اور خواہشوں کا بندہ پایا۔ میں اس سے خوب گھل مل گئی۔ لیکن چند دن کے بعد جو میں اس کے مکان

میں گئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ اس کے کمرے میں میری تصویروں کے پاس کسی اور لڑکی کی تصویریں بھی لٹکی ہوئی ہیں۔ ایک تصویر کے نیچے اسی نوجوان کے قلم سے یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔

"میری محبوب ترین"

مجھے احساس ہوا کہ میں نے پھر ٹھوکر کھائی! لیکن افسوس کرنے سے اب کیا ہو سکتا تھا۔ میری زندگی کا دوسرا سیاہ ورق، کردار کے قلم سے لکھا جا چکا تھا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا مگر ملامت سے ہوئی بات ان ہوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

فریب پر فریب :۔ میں اب مرد دل کو انتہائی شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگی۔ انتہا یہ ہے کہ میرے والد جب مجھ سے شفقت کے ساتھ باتیں کرتے تو میں بعض وقت سمجھنے لگتی کہ یہ بھی مجھے فریب دیا جا رہا ہے۔ مگر یہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے بعد میں نے اپنی زندگی میں کتنی ہی بار فریب کھایا۔ میں کیا کروں، مرد جب انتہائی سادگی اور بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا ہے:۔

"کہ مجھے تم سے محبت ہے"

تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ سچ کہا جا رہا ہے۔ بس یہی "یقین" ہر بار میری تباہی و بربادی کا باعث ہوتا ہے۔ شاید میرے جذبات بھی کوئی حیلہ اور آڑ چاہتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ بیمار پڑی تو ایک ڈاکٹر نے انتہائی دلچسپی اور جانفشانی کے ساتھ میرا علاج کیا میرے اچھے ہو جانے کے بعد ڈاکٹر ہمارے یہاں آنے جانے لگا ربط، ضبط بڑھا اور تاریخ پھر اپنے کو دہرانے لگی، ڈاکٹر کی ملتجی نگاہوں نے

مجھ سے کہا کہ وہ ایک ہمدرد عورت کی تلاش میں ہے۔ اس کی التجا اور محبت کا جواب میں نے محبت سے دیا، چند دن تک پُر لطف صحبتیں رہیں لیکن دوسرے مردوں کی طرح ڈاکٹر نے بھی آخر تک چل کر سرد مہری کا برتاؤ کیا اور وہ بھی مجھے پُر گناہ جذبات کی دلدل میں پھنسا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

کلیسا کے ایک راہب سے میری ملاقات ہوئی، میں اس کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئی، میں اس کو انتہائی پاکباز اور نیک نفس سمجھتی تھی، اس کی لانبی سفید داڑھی اس کی زمین پر گھسٹتی ہوئی نیچی عبا، اس کے سینے پر جگمگاتی ہوئی صلیبیں سائل کا حضرت مریمؑ اور حضرت مسیحؑ کے مجسموں پر عقیدت کے ساتھ آنکھیں جھکائے ہوئے روغن زیتون ملنا، یہ تمام باتیں ایسی تھیں کہ میں اس راہب کو فرشتہ سمجھتی تھی۔ لیکن بعد میں چلکر وہ راہب بھی ہوس کار ثابت ہوا اور کلیسا کی محراب کے نیچے ہی اس نے پہلی مرتبہ میرے سینہ کو سہلا کر کہا۔

"یہ میرا پہلا اقدام ہے"

میں خوف سے کانپ گئی۔ کیونکہ کنواری مریمؑ اور حضرت مسیحؑ کے مجسمے میرے سامنے تھے۔ پادری نے میری اس جھجک کو دیکھ کر کہا۔

"گناہ سے ڈرتا کیا! خدا کا بیٹا مسیحؑ دار پر چڑھ کر تمام انسانوں کے گناہوں کا کفارہ ہو چکا ہے"

پادری اور میں اب دونوں لطف و لذت کی وادیوں سے گذرنے لگے۔ دوسرے مردوں کے مقابلہ میں کلیسا کا یہ راہب، ذرا مستقل مزاج ثابت ہوا۔ اور وہ اس

لیے کہ دوسروں کے مقابلہ میں اسے اس قسم کے رنگین موقع بہت کم ملتے تھے، اس کی قوت بڑی حد تک محفوظ تھی۔ لیکن اب میں چل کر وہ ایک دوسری لڑکی پر مائل ہو گیا اور اس کی آغوش میں اب میرے لیے گنجائش نہ تھی۔

اپنی سیاہ کارانہ زندگی پر میں آج تک ماتم کر رہی ہوں مگر اس تباہی کی بہت کچھ ذمہ داری معمول کے "فریب" اور "بناوٹ" پر عاید ہوتی ہے۔ میرا یہ تجربہ ہے کہ مرد صرف جوانی اور لذت کا پجاری ہے، اور اس کی لذت اور چٹخاروں کے عنوان جلد جلد بدلتے رہتے ہیں، وہ ایک لذت سے بہت جلد سیر ہو جاتا ہے۔ عورت کو فریب میں لانے کے لیے اس کے پاس بہت سے "انچھر" موجود ہیں، وہ بناوٹ کو حقیقت بنا کر پیش کرنے کی قابلیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ مرد بھونرے کی طرح ہر پھول کا رس چوسنا چاہتا ہے۔ اس کی لذت کا نظریہ "تنوع" اور Variety ہے

میری زندگی کے سیاہ ورق شاید دوسری عورتوں کے لیے باعث عبرت ہو سکیں۔ مرد میری داستان کو پڑھ کر خفا ہوں گے مگر میں انکی خفگی کے خوف سے سچی بات کو چھپا نہیں سکتی۔ کاش عورتیں اپنے جسموں کی کپکپیوں اور انگڑائیوں پر قابو رکھ سکتیں!

ڈاکخانے کی کھڑکی پر

دھرم آباد کے ہیڈ پوسٹ آفس میں منی آرڈر کی کھڑکی پر لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی
ے جو یہاں آتا ہے، جانے کا نام ہی نہیں لیتا۔ بعض لوگوں کو منی آرڈر کی رسید
مل چکی ہے۔ اور وہ اپنے کام سے فارغ ہو چکے۔ مگر وہ خدا کے بندے یہاں سے
کا نام ہی نہیں لیتے کھڑے ہوئے ہیں۔ جیسے ان کا کوئی ضروری کام باقی رہ گیا ہے
جٹری اور پارسل کی کھڑکیوں پر کھڑے ہوؤں کی نگاہیں بھی ادھر ہی پڑ رہی ہیں
ں کتابوں میں جو پڑھا تھا کہ چشمۂ آب حیواں پر پہنچکر جس نے بھی ایک آدھ
ٹ پانی پی لیا۔ بس وہ وہیں کا ہو رہا اور وہاں سے واپس نہیں آسکتا۔ تو ڈاکخا

کی یہ کھڑکی بھی آبِ حیواں کی مانند ٹھہر رہی ہے کہ لوگ پہنچ تو جاتے ہیں۔ مگر واپس نہیں ہوتے۔

پوسٹ آفس کے مشرقی حصہ میں ایک بڑا سا صندوق رکھا ہوا ہے۔ دونوں جوان جو بظاہر ایک دوسرے کے پہلے سے شناسا معلوم ہوتے ہیں۔ صندوق پر بیٹھے ہوئے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں،۔

اس لڑکی سے پہلے جو یہاں منی آرڈر کلرک تھا، کتنا بدصورت تھا۔ موٹی اور خمدار ناک پچکے ہوئے گال چھوٹی اور گول آنکھیں، پیلا رنگ، پستہ قد، لاحول ولاقوۃ! قدرت نے اس کے ساتھ مذاق کیا تھا۔

بھئی! اس کی جگہ جو یہ لڑکی کلرک ہو کر آئی ہے، کتنی خوبصورت اور جاذبِ نظر ہے بس ذرا اس کے تو البتہ چھوٹے ہیں۔ باقی بدن کا ایک ایک جوڑ سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ آنکھوں کو دیکھئے جیسے خوب گہرا کاجل لگا کر آئی ہے۔ ارے! تم آنکھوں ہی پر لوٹ ہوئے جاتے ہو۔ اس کے رخسار کے تل کو تو دیکھو اُف! قیامت ہے قیامت اتنا سفید، سرخ اور گداز رخسار اور اس پر اتنا گہرا سیاہ اور پھیلا ہوا تل قسم کھاتا ہو تمہارے سر کی! میرے تو ہونٹ بے چین ہوئے جا رہے ہیں۔

اس لڑکی سے پہلا بابو مریل ٹٹو کی طرح کام کرتا تھا۔ اس کی سستی کی سب لوگ شکایت کرتے تھے۔ سست ہونے کے ساتھ کج خلق بھی تھا ذرا کام کی زیادتی ہوئی اور اس کے سیاہ اور تنگ ماتھے پر بدنما سلوٹیں ابھر آئیں۔ لیکن یہ لڑکی مشین کی طرح کام کرتی ہے، ذرا سی دیر میں منی آرڈر پڑھا۔ اِک ذرا پلک جھپکاتے

میں روپے گنے اور کھٹ سے رسید لکھی اور منی آرڈر کرنے والے کے ہاتھ میں دے کر دوسرے کے ہاتھ سے منی آرڈر لے لیا۔ صاحب! یہ لڑکی کاہے کو ہے بجلی ہے بجلی آپ دیکھ رہے ہیں اس کی پھرتی کو کیسی اطمینان اور تیزی کے ساتھ کام کر رہی ہے۔

یہ لڑکی ابھی ہیڈ پوسٹ آفس سے بدل کر آئی ہے۔ میرے ایک دوست ریلوے میل سروس میں ملازم ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اس لڑکی کا نام مس کریا ہے۔ اس کے باپ مدراس کے کسی قصبہ میں پادری ہیں۔

ترجمہ با دوست فدا . . . .

ان دونوں کی باتیں ابھی ختم بھی نہ ہوئی تھیں کہ ڈاک خانہ کے ملازم نے آکر کہا:۔

"- بابو صاحب! ذرا دیر کے لئے تکلیف فرما کر کھڑے ہو جائیے مجھے صندوق سے رجسٹر نکالنے ہیں"

یہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور باتوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

آج ہفتہ کا دن ہے۔ کل اتوار کو چھٹی ہوگی، اسلئے آج لوگوں کی بھیڑ دوسرے دنوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے، یار لوگ آئے تو تھے منی آرڈر کرنے کو۔ مگر اس حسین عورت کو دیکھ کر عشق بازی شروع کر دی۔ ہر شخص اس قدر التفات، استغراق اور ذوق و شوق کے ساتھ لڑکی کی طرف دیکھ رہا ہے کہ یہ اب جان دیئے بغیر نہیں جائے گا۔ ان عاشقوں میں نوجوان بھی ہیں، اور بوڑھے بھی۔ نوجوانوں کو تو بہر حال دل پھینک ہونا ہی چاہیئے مگر ایک ساٹھ ستر برس کا بڑھا بھی گھور گھور کر دیکھ رہا ہے زبان حال سے یہ شعر ہے

میرے چہرے کی جھریاں پہ نہ جا
دل ابھی تک جوان ہے پیارے

پڑھتے ہوئے لوگ مس کریا کے نظارہ و تکلم کا لطف لینے کے لئے بات میں سے بات نکال کر فرصتِ دید کو زیادہ سے زیادہ طویل بنانے کی کوشش کر رہے ہیں کتنی دلچسپ تھیں ان لوگوں کی باتیں۔

"میم صاحبہ! یہ علیم گنج سب آفس نہیں ہے، برانچ آفس ہے۔ اس کا ضلع میرٹھ ہے۔ ایک علیم گنج پنجاب میں بھی ہے ایسا نہ ہو کہ منی آرڈر پنجاب پہنچ جائے۔"

"اچھا تو منی آرڈر کی فیس بڑھنے کی خبر غلط ہے! ہم نے تو سنا ہے کہ پہلی جون سے منی آرڈر کا محصول بڑھ جائے گا۔ مگر ہاں آپ کو تو ہم سے زیادہ معلومات ہونی چاہئیں"

"مس صاحبہ! میرا خط خراب ہے اگر تکلیف نہ ہو تو پوسٹ آفس کے نام کے نیچے آپ ذرا سرخ روشنائی سے لکیر کر دیں۔"

اچھا تو ملتیں آج کل ڈاک نہیں جاتی۔ ہمیں تو وہاں ضرور خط بھیجنا ہے، آخر کب تک یہ صورت باقی رہے گی۔"

"دیکھئے! آپ کے چہرے پر پسینہ آرہا ہے۔ آپ رومال سے پہلے پسینہ پونچھ لیں، رسیدبک یا منی آرڈر پر بوندیں گر گئیں تو سیاہی پھیل جائے گی۔"

"میم صاحبہ! یہ چونی جو آپ نے واپس دی ہے بہت زیادہ گھسی ہوئی ہے خیر میں آپ کی خاطر سے لئے لیتا ہوں۔"

مس کریا مسکراتے ہوئے ان باتوں کو سنتی۔ ممکن ہے کہ وہ زیادہ تجربہ کار نہ ہو لیکن نادان اور کم سمجھ نہ تھی۔ وہ لوگوں کی باتوں کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اس کا چہرہ اس احساس کے ساتھ خوشی کے مارے تمتما رہا تھا کہ اتنے بہت سے آدمی اس کو

محبت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں اس کا زیر لب تبسم کسی خاص آدمی سے متعلق تھا مگر ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ یہ مسکراہٹ اسی کے ذوق بے تاب کی بازگشت بے تاب تمنا کا جواب ہے۔ وہ کبھی کبھی تماشائیوں کی طرف دیکھتی اور ذرا سی دیر سب پر نگاہ ڈالتے ہوئے پھر اپنے کام میں مشغول ہو جاتی۔

تین بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ کھڑکی کی بھیڑ چھوٹ چکی تھی۔ مس کرینا میز دراز سے منی آرڈر فارموں کو نکال کر نمبر وار جما رہی تھی کہ اتنے میں ایک نوجوان نس کا ریکیٹ جس پر رشید لکھا ہوا تھا ہاتھ میں لیے ہوئے جھانکتا ہوا کھڑکی پر ۔ چھریرا بدن، لانبا قد، کھلتا ہوا رنگ بھیگی ہوئی قمیص، رخساروں پر پسینہ بوندیں ڈھلکتی ہوئیں۔ رشید مردانہ حسن کی تمام جاذبیتیں اپنے اندر رکھتا تھا۔

" آپ منی آرڈر کلرک ہیں، اوہ بابو کہاں چلا گیا کیا نام تھا اس کا ۔۔۔ خیر حال ۔۔۔

رشید ابھی کچھ اور کہنا ہی چاہتا تھا۔ کہ مس کرینا اس کی بات کاٹتی ہوئی بولی:-

- اس بابو کا تبادلہ ہو گیا۔ میں اس کی جگہ یہاں تبدیل ہو کر آئی ہوں"

رشید نے کوٹ کی جیب سے منی آرڈر فارم نکال کر مس کرینا کو دیا۔ مس کرینا منی آرڈر فارم پڑھنے لگی۔

" یہ منی آرڈر آپ ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔" مس کرینا رشید کی طرف خوب غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

" جی ہاں! میں نے ہی لکھا ہے" رشید نے بے پروائی کے ساتھ جواب دیا۔

"آپ کا خط بہت خراب ہے" مس کرنیا اپنے رخسار کے تل کو سہلاتے ہوئے بولی:۔
مجھے صاحبہ! آپ کے ڈاک خانہ میں نوکری کرنی نہیں ہے۔ آپ کے یہاں درخواست دوں تو نامنظور کر دیجئے۔ آپ کو میرے خط کے اچھے اور برے سے کیا مطلب! کام کی بات کیجئے" رشید نے جیب سے روپیہ نکالتے ہوئے کہا۔

مس کرنیا نے اس پر مسکرا کر رسید بک کو کھولا۔ رشید نے روپے نکال کھڑکی کے تختہ پر رکھدے مس کرنیا نے روپوں کو شمار کیا۔

"یہ دو روپے آپ کے خراب ہیں۔ دوسرے دیجئے" مس کرنیا نے روپے لوٹاتے ہوئے کہا۔

"ان روپوں میں کیا خرابی ہے! یہ ڈاک خانے والے ہمیشہ ایسی منطق چھانٹتے رہتے ہیں۔ یہ قانون قاعدہ کیا ہوا۔ پبلک کو ستانا اور تنگ کرنا ہے" رشید پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔

"دیکھئے تین بجنے میں دو منٹ رہ گئے ہیں جلدی دوسرے روپے دیجئے۔ وقت ختم ہونے کے بعد مجھے اکاؤنٹ بند کر دینا پڑے گا" مس کرنیا نے پنسل کو ہونٹوں میں دباتے ہوئے جواب دیا۔

"میرے پاس تو صرف چند آنے ہیں۔ اب تو اتنا وقت بھی نہیں رہا کہ میں گھر جا کر روپیہ لا سکوں۔ کل اتوار ہے اور بھائی صاحب کو پیر کے دن روپیہ ملنا ضروری ہے۔ کیا آپ کچھ نہیں کر سکتیں؟" رشید نے قدرے نرم لہجہ میں کہا۔

"آپ کی گھبراہٹ بڑی دلچسپ ہے۔ ابھی آپ غصہ میں تھے اور ایک دم ٹھنڈے

پڑ گئے۔ یہ مرد اتنے متلون مزاج کیوں ہوتے ہیں۔ آپ کی خاطر میں آپ کے روپے لے لیتی ہوں لیکن خزانہ والے ان کو شاید قبول نہ کریں گے۔ اگر ممکن ہو سکے تو کل کسی وقت تشریف لاکر، دوسرے روپیہ دے کر ان روپوں کو لے جائیے مس کرینا نے جواب دیا۔

—آپ کی مہربانی کا شکریہ! میں کل اسکول جاتے ہوئے آپ کے روپیہ ضرور بدل دونگا۔ اطمینان رکھیے" رشید سگرٹ سلگاتے ہوئے بولا۔

یا تو مس کرینا کی پھرتی کا وہ عالم تھا۔ کہ ادھر کسی نے منی آرڈر فارم دیا اور اس نے آناً فاناً میں رسید کاٹ کر اس کے حوالے کر دی۔ اور اس وقت وہ قصداً کام میں دیر کر رہی تھی۔ اس نے دو تین منٹ میں رسید لکھی اور اس عرصہ میں کئی مرتبہ رشید کی طرف دیکھا۔ رشید کا دماغ شام کو ہونے والے ٹینس فائنل میں الجھا ہوا تھا۔ سو وہ مس کرینا کی کھنچتی نگاہوں کو بالکل نہ سمجھ سکا۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ جاری کو جیت سے زیادہ ہار پیاری ہوتی ہے۔ تو پیار اور محبت میں بھی شکست اور ناکامی میں آدمی کو زیادہ لطف آتا ہے۔ کامیابی اور شادکامی کے سایہ میں محبت کا پودا نشو و نما نہیں پاتا۔ رشید کی بے التفاتی نے مس کرینا کو اور زیادہ بے چین کر دیا۔ اس نے رسید کاشکر میز پر رکھدی اور بات چیت کرنے لگی۔

—آپ کس اسکول میں پڑھتے ہیں" مس کرینا نے کہا۔

—میں گورنمنٹ ہائی اسکول میں پڑھتا ہوں" رشید نے جواب دیا۔

—آپ ٹینس بھی کھیلتے ہیں" مس کرینا نے دریافت کیا۔

"جی ہاں" رشید نے گفتگو ختم کرنے کے لئے انتہائی مختصر جواب دیا۔

"مجھے بھی ٹینس کا بہت شوق ہے۔ میں کلکتہ میں وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کی ممبر تھی یہاں سنا ہے اسکی کوئی شاخ نہیں ہے۔ اچھا ہاں! آپ کتنی عمر سے ٹینس کھیلتے ہیں۔ اور ہاں! آپ کو کیا والی بال سے بھی دلچسپی ہے! آپ کا بدن کھیل کے لئے بہت موزوں ہے۔ آپ بڑے ہو کر بہترین اسپورٹسمین ثابت ہوں گے۔" مس کرینا نے رشید کی طرف خوب غور سے دیکھتے ہوئے یہ جملے کہے۔ وہ بات کرتے ہوئے مسکراتی بھی جاتی تھی۔ رشید پر اس التفات و تبسم کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔ اس کا دماغ ٹینس کورٹ کی لکیروں کے طواف کر رہا تھا۔ اس نے نہایت بے پروائی کے ساتھ جواب دیا۔

"معاف فرمایئے! میرے پاس بات کرنے کے لئے بالکل وقت نہیں ہے۔"

مس کرینا نے رشید کو منی آرڈر کی رسید دی اور وہ تیزی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مس کرینا اپنا دل رشید کو نذر کر چکی تھی۔ مگر ہاں! اتنا ضرور ہے کہ وہ اس سے متاثر ضرور ہوئی اور اسی تاثر نے منی آرڈروں کی میزان کو کسی قدر غلط بنا دیا۔ اور وہ غریب بہت دیر تک میزان میں سر کھپاتی رہی۔

دوسرے دن اتوار تھا۔ تیسرے دن رشید روپے لے کر پوسٹ آفس آیا۔ منی آرڈر کی کھڑکی پر بہت بھیڑ تھی۔ رشید نے کھڑکی تک پہنچنے کی کوشش کی، لوگوں نے کہا۔

"پہلے ہمارا کام تو ہو جائے۔ آپ سب کے بعد آئے ہیں۔"

مس کرینا کی نگاہ رشید پر پڑی۔ رشید نے اس کو دیکھ کر ہاتھ سے بتایا کہ روپے لیکر آیا ہوں۔ مس کرینا نے کھڑکی پر کھڑے ہوئے لوگوں سے کہا کہ ان کے آنے کے لئے

جگہ وہ لوگ ہٹ گئے۔ رشید نے لڑکی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے روپے کھڑکی کے تختہ پر رکھ دیئے۔ مس کرنا نے میز کی دراز سے رشید کے دیئے ہوئے خراب روپے نکال کر اس کو واپس کر دیئے۔ رشید نے شکریہ ادا کیا۔ وہ انتہائی التفات کے ساتھ مسکرائی۔ رشید کھڑکی سے واپس آیا تو سب لوگ اس کو غصہ اور رشک کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کا بس چلتا تو غریب رشید سے اسباب کا توبہ نامہ لکھا کر چھوڑتے کہ وہ اب کبھی پوسٹ آفس میں قدم بھی نہ رکھے گا۔ رشید اپنے رقیبوں کی بھیڑ سے نکل کر ڈاک خانے کے باہر آیا اور اپنی سائیکل پر بیٹھ کر بے پروائی اور آزادی کے ساتھ۔

ع وہ آکے پھول برسا گئے مرے پھولوں کی محفل میں

گاتا ہوا اسکول روانہ ہو گیا۔

رشید کو پوسٹ آفس آنے کی کوئی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ مس کرنا کی آنکھیں البتہ اس کی منتظر رہیں۔ ایک آدھ بار کہیں راستہ میں آتے جاتے رشید نے مس کرنا کو دیکھا اور اسے یاد آگیا کہ یہ لڑکی پوسٹ آفس میں ملازم ہے۔ اور اس نے اس کے ساتھ تھوڑی ہمدردی کی تھی۔ ایسی باتیں روزانہ کی زندگی میں پیش آتی رہتی ہیں۔ ان سے کوئی متاثر نہیں ہوا کرتا۔ رشید پر بھی پوسٹ آفس کے واقعہ کا کوئی اثر نہ تھا۔

اس واقعہ کے چند ماہ بعد شام کو کمپنی باغ کے ایک تنہا گوشہ میں رشید کو ایک حسین اور نوخیز لڑکی کے ساتھ سبزے پر بیٹھا دیکھا گیا۔ یہ دونوں ایک کیاری میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کیاری کے چاروں طرف گھنے پودے تھے۔ جن پر مولسری کی ڈالیاں جھکی ہوئی تھیں۔ مس کرنا بھی اس شام کو باغ کی سیر کے لئے آئی تھی۔ وہ رشید کو کمپنی باغ میں

داخل ہوتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ اور دور دور رہ کر اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ اس کی بے تاب
نگاہوں کے سامنے گلاب کے تختہ کے قریب ایک لڑکی رشید کے ساتھ ہولی۔ مس کرینا
نے ان دونوں کا تعاقب کیا۔ وہ دونوں پودوں سے گھری ہوئی کیاری میں جا کر بیٹھ گئے
مس کرینا دبے پاؤں کیاری کے قریب پہنچ گئی۔ رشید اتنی سی دیر میں نہ جانے کیا کچھ کہہ چکا
تھا۔ اس کے آخری جملے یہ تھے۔

۔ کتنا سہانا وقت ہے۔ بیلے کی کلیوں کو تو دیکھو، کتنی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ تم کو دیکھ
کر شاید یہ مسکرا رہی ہیں۔ تم اس قدر خاموش کیوں ہو۔ آدمی کو اس قدر بے پروا بھی نہ
ہونا چاہیئے۔

اس پر لڑکی نے بے پروائی کے ساتھ جواب دیا۔

"معاف فرمائیے! میرے پاس بات کرنے کے لئے وقت نہیں ہے"
مس کرینا نے اس پر قہقہہ لگایا۔ لڑکی نے سہم کر اور گھبرا کر اپنے چہرے کو ڈالیوں
میں چھپا لیا۔ رشید سٹ پٹا کر کھڑا ہو گیا۔ مس کرینا اور رشید کی آنکھیں دوچار
ہوئیں۔ مس کرینا روش کے پودے کی ڈالی لچکاتی ہوئی بولی:۔
۔ آپ کے پاس میرے لئے وقت نہیں تھا۔ اور آج ان کے پاس آپ کے لئے بالکل
وقت نہیں ہے۔! قدرت کے حسین انتقام کو دیکھا"
رشید پشیمان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اور مس کرینا باغ کے تالاب کی طرف
چلی گئی۔

خانصاحب

وہ جو کسی نے کہا ہے ۔۔ ع آدمی پہچانا جاتا ہے قیافہ دیکھ کر
خط کا مضموں بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر

تو ہمارے خانصاحب کو دیکھ کر اجنبی سے اجنبی آدمی بھی آسانی سے معلوم کر لیتا تھا کہ اس قماش اور بشرے کے آدمی "جنت الحمقاء" کے سوا اور کہیں نہیں پلتے۔ خانصاحب ہمالیہ پہاڑ سے بھی بڑے مغالطوں میں مبتلا تھے۔ ان کے مغالطے بہت زیادہ دلچسپ تھے مگر بعض وقت دلچسپیوں کی شدت ناگوار بھی معلوم ہوتی تھی۔ خانصاحب کے متعلق لوگوں میں عجیب عجیب باتیں مشہور تھیں کوئی کہتا تھا کہ خانصاحب کی دادی کو آخری عمر میں مراق اور مالیخولیا ہو گیا تھا۔ کسی کا بیان تھا کہ خانصاحب مئی کے مہینہ میں اس وقت پیدا

ہوئے تھے جب کہ چیل انڈا دیتی ہے۔ کوئی روایت کرتا تھا کہ خانصاحب کے باپ نے پارہ کا کشتہ کھا لیا تھا۔ حکیم صاحب کی نوازش سے یا لاپرواہی سے۔ بس ایک آنچ کی کسر رہ گئی اور اس کشتہ کے کھاتے ہی۔ خانصاحب کے والد بزرگوار کو خفقان ہو گیا۔ بہرحال جتنے منہ اتنی باتیں۔ اس اختلاف روایات سے یہ نتیجہ خود بخود نکل آتا ہے کہ خانصاحب کو لوگ بے وقوف ضرور سمجھتے تھے اور لوگ خانصاحب کی حماقت کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

خانصاحب کا رنگ بہت کالا تھا۔ جامن کے رنگ سے ملتا جلتا۔ چہرے پر چیچک کے گہرے گہرے نشان تھے۔ پچکے ہوئے گال، بیٹھی ہوئی ناک۔ جس کے بیچ کے حصہ میں نہ معلوم کس طرح تھوڑا سا زخم بھی پیدا ہو گیا تھا۔ خانصاحب کا قد بھی بہت زیادہ پست تھا۔ اس شکل و صورت پر آپ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ آپ بے حد خوبصورت ہیں۔ اور عورتیں آپ کی صورت کو دیکھ کر بس لٹ ہی تو ہو جاتی ہیں۔ خانصاحب اپنے شباب کے قصے، یار دوستوں میں بڑے مزے لے لے کر سناتے اور باتیں اس انداز کے ساتھ کرتے کہ جیسے سچ مچ وہی ہوا ہے، جو کچھ خانصاحب کی زبان سے بیان ہو رہا ہے۔ یار لوگ ہنستے، مذاق اڑاتے۔ مگر یہ خدا کا بندہ، ہر مذاق کو داد اور ہر قہقہہ کو تعریف سمجھتا۔ ان کی باتیں کتنی پُرلطف ہوتی تھیں:۔

بھائیو! میری عمر کوئی اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی، جوانی کی امنگیں، شباب کا جوش... قسم خدا کی، ہاتھی اور شیر سے الجھنے کو جی چاہتا تھا۔ ہمارے مکان کے قریب ڈاک خانہ کا بابو رہتا تھا۔ اس کے گھر کی عورتیں ہمارے یہاں آتی جاتی تھیں۔

ایک دن شام کے وقت میں اپنے مکان کے سامنے چبوترے پر بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا، کہ اتنے میں ڈاک خانے کے بابو کے یہاں کی نوکرانی نے آ کر کہا کہ بیگم صاحب آپ کو بلا رہی ہیں۔ میں نوکرانی کے کہنے پر ننگے سر چپل پہنے ہوئے اس کے ساتھ چل دیا۔ نوکرانی مکان کے اندر داخل ہوئی مگر میں ٹھٹک کر رک گیا۔ نوکرانی نے ہنس کر کہا۔ "سرکار اندر آیئے۔ آپ تو بڑے شرمیلے ہیں۔" تو صاحب! میں شرماتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اور نوکرانی کے پیچھے پیچھے صحن میں ہوتا ہوا دالان میں پہنچا۔ وہاں جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ دودھ سے زیادہ سفید چاندنی بچھی ہے ستون کے قریب مخملی قالین پر نہایت بھڑکیلا گاؤ تکیہ لگا ہوا ہے اور گاؤ تکیہ پر تازہ پھولوں کے نہایت ہی خوشنما گجرے پڑے ہوئے ہیں۔ میں ابھی چاندنی پر بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک نہایت ہی خوبصورت عورت زرق برق کپڑے پہنے ہوئے آئی اور سیدھا تھام کر بولی:۔

"جہاں آدمی، اتنا نہیں شرمایا کرتے آؤ قالین پر بیٹھیں گے۔"

دوستو! اس عورت کا اتنا کہنا تھا کہ مجھے شرم کے مارے پسینہ ہی تو آ گیا۔ اور میرا سینہ زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ اس عورت کی عمر انیس بیس سال کی ہو گی۔ سرخ سپید رنگ۔ کتابی چہرہ، رسیلی آنکھیں، اچھرا بدن، عورت کیا تھی حور تھی حور! میں بدن چراتا ہوا قالین پر بیٹھ گیا۔ عورت نے گجرے میری گردن میں ڈالدیئے اور کہنے لگی:۔

تمہیں کیا معلوم کہ میں کب سے تمہارے فراق میں تڑپ رہی ہوں
آج قسمت نے یہ دن دکھلایا ہے کہ میں اور تم ایک جگہ بیٹھے ہوئے ہیں،

میں نے تم کو پہلی مرتبہ تمہارے مکان ہی میں جلپن کی آڑ سے دیکھا تھا
تمہارے رنگ روپ کو دیکھ کر جی لوٹ ہی تو گیا، تمہارے چھپک کے
داغوں کی پھبن کوئی میرے دل سے پوچھے، اور۔۔۔ ہاں۔۔۔

وہ عورت ابھی پوری بات کہنے بھی نہ پائی تھی کہ دروازہ پر کسی نے دستک دی
دستک کا سننا تھا کہ عورت کا چہرہ فق پڑ گیا۔ میں نے کہا کہ تم اتنی سہمی کیوں جاتی ہو۔
عورت نے گھبرا کر جواب دیا۔ کہ بابو جی دفتر سے آج جلدی آ گئے۔ اور ہاں! سنو،
غور سے سنو بابو جی سائیکل کی گھنٹی زور زور سے بجا رہے ہیں۔

عورت کا یہ کہنا تھا کہ میری سٹی غائب ہو گئی۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا:۔
"خدا کے لئے مجھے بچاؤ۔"

عورت نے تھوڑی دیر سوچا، اور پھر بولی کہ تمہارے بچنے کی صرف ایک صورت
ہے اور وہ یہ کہ صحن میں جو مرغیوں کی بڑی سی ٹاپ رکھی ہوئی ہے تم اس میں بند ہو جاؤ۔
بابو جی ہاتھ منہ دھونے کے لئے غسلخانہ میں جائیں گے اسوقت تم نکل جانا۔" ڈر کے
مارے میں تو پیلا پڑا جاتا تھا۔ عورت سے میں نے کہا۔ "اچھا مجھے منظور ہے۔
عورت نے مرغیوں کی ٹاپ اٹھائی اور میں سکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے احتیاط
کے ساتھ ٹاپ زمین پر رکھ دی۔ عورت نے دروازہ پر جا کر کنڈی کھولی۔ اور اس
کا شوہر صحن میں داخل ہوا۔ اس کے پیروں کی چاپ سنکر میرے تو ہوش اڑ گئے۔
میں پسینہ میں شرابور تھا۔ اور سانس کو تو میں نے اس طرح روک لیا تھا جیسے مجھ پر
کسی نے مسمریزم کا عمل کر دیا ہے۔ اس ٹاپ میں چھ مرغیاں اور دو مرغے تھے۔

مجھے دیکھ کر مرغیاں اور مرغ سہم گئے۔ خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے شور نہ مچایا۔ اور نہ پروں کو پھڑپھڑایا۔ نہیں تو سارا بھید کھل جاتا اور بے صبری کے ساتھ اس بات کا انتظار کر رہا تھا کہ کب اس عورت کا شوہر غسلخانہ میں جاتا ہے اور کب ٹاپ کو اٹھایا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد عورت نے ٹاپ اٹھائی اور غسلخانہ کی طرف گھبرا کر دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولی:۔

ذرا جاگ جاؤ۔۔۔!

جیسے کوئی حبس دوام کا قیدی میعاد سے پہلے چھوڑ دیا جاتا ہے اور جیلخانہ سے نکل کر بھاگتا ہے اسی طرح میں ٹاپ سے نکلکر بھاگا۔ اور گھر پہنچکر دم لیا۔

خانصاحب کی اس داستانِ شکم زاد پر لوگوں نے سوالات کرنے شروع کئے اور خانصاحب نے لوگوں کے سوالات کے دھڑلے کے ساتھ جواب عطا فرمائے۔

خانصاحب! تو وہ عورت آپ پر سچ مچ عاشق ہو گئی تھی۔

عاشق نہیں ہو گئی تھی تو ویسے ہی اپنے گھر میں بلا رہا تھا۔

اچھا خانصاحب! جب آپ ٹاپ میں بند ہو گئے ہیں تو مرغیاں کیا کر رہی تھیں؟

مرغیاں۔۔۔! کبوتر۔۔۔ لاحول ولا قوۃ، صرف مرغیاں ہی تو تھیں، تو وہ مرغیاں وہی کر رہی تھیں جو عام طور پر دڑبوں میں کیا کرتی ہیں۔

یعنی۔۔۔! خانصاحب! صاف صاف فرمائیے۔

جائیے! تم قیل کی کمال نکالتے ہو، سنو! ایک مرغا تو عشق بازی کر رہا تھا اور تین مرغیاں خاموشی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔

خانصاحب! انڈے بھی تو ہوں گے اس ٹاپ میں...!

ہاں! انڈے کیوں نہ ہوتے، دو انڈے تو میرا گھٹنا لگ کر پھوٹ گئے اور دو انڈے میں جیب میں رکھ کر لے آیا۔

اچھا خانصاحب! آپ کو ٹاپ کا مرغا کہیں تو آپ برا تو نہ مانیں گے۔

برا مانیں گے اور ضرور برا مانیں گے۔ ٹاپ کا مرغا کیوں کہتے ہو...! عشق و محبت کا مرغا کہو تو کچھ بات بھی بنے۔

خانصاحب کے یہ گھڑے ہوئے پر لطف قصے، ہفتوں اور مہینوں لوگوں کو ہنساتے خانصاحب کو ہر محفل میں بنایا جاتا۔ مگر وہ یہی سمجھتے کہ اُن کی تعریف ہو رہی ہے اور لوگ اُن سے نہ صرف متاثر ہیں، بلکہ مرعوب ہیں، خانصاحب کو اپنی ہمہ دانی، قابلیت اور عام معلومات کا بھی زعم تھا۔ ہر مسئلہ میں ٹانگ اڑاتے اور ہر بات میں دخل دیتے۔

مردم شماری کے زمانہ میں "خانصاحب" نے کوشش کر کے اپنا نام مردم شماری کرنے والوں کی فہرست میں لکھا دیا۔ لوگوں نے ان کو باور کرا دیا کہ جس شخص کی فہرست مردم شماری میں سب سے زیادہ تعداد ہو گی۔ اس کو حکومت کی طرف سے پروانہ خوشنودی ملے گا، اور کیا عجب ہے کہ کوئی خطاب بھی ملجائے۔ خانصاحب کے سپرد ایک محلہ کیا گیا۔ پچھلی مردم شماری میں جس کی آبادی دو ہزار کے قریب تھی خانصاحب سن چکے تھے۔ اور سن کیا چکے تھے بلکہ اُن کے دل میں یہ بات اُتر گئی تھی، کہ جس کی فہرست مردم شماری میں سب سے بڑی تعداد درج ہو گی۔ اس کو سرکار کی طرف سے پروانۂ خوشنودی ملے گا۔ اس لئے خانصاحب نے سوچا کہ ہر گھر پر جا کر لوگوں

کی تعداد پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ کام تو گھر بیٹھے ہو سکتا ہے۔ خانصاحب نے بعض دوستوں سے بھی اپنی سوچی ہوئی بات کا مشورہ کیا۔ یار لوگ تو خانصاحب کی تازہ ترین حماقتوں کی ٹوہ میں ہی رہتے تھے۔ ان لوگوں نے خانصاحب کو اور زیادہ پختہ کر دیا کہ آپ کسی مردود کے گھر نہ جایئے۔ اپنے گھر بیٹھ کر فہرستوں کی خانہ پری کر دیجئے۔

دوسرے محلوں کی مردم شماری کرنے والے تو گھر گھر گھوم پھر کر فہرستیں مرتب کرتے پھر رہے تھے اور ہمارے خانصاحب اپنے دیوان خانے میں اس ٹھاٹ باٹ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ چوکی پر بڑی سی تھالی رکھی ہوئی تھی۔ جو گلوریوں سے لبریز تھی ایک چھوڑ دو لالٹینیں دونوں تپائیوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ اور خانصاحب اس شان کے ساتھ منہ میں لگائے ہوئے مردم شماری کی فہرستوں کی خانہ پری فرما رہے تھے۔ خانصاحب نے تھوڑی سی دیر میں فہرست مرتب فرما لی۔ اور آخر میں جو میزان کے ہندسے لکھتے ہوئے زور سے بولے :-

"مار لیا میدان مار لیا"۔ یہ شہر کے لونڈے کہیں ہم کو پہنچ سکتے ہیں ؟ خانصاحب نے یہ جملہ فرطِ مسرت سے بے تاب ہو کر اس زور سے کہا کہ خانصاحب کی بیوی کو دیوانخانہ میں معاً آجانا پڑا۔

"یہ آج تم آپ ہی آپ کیا کہہ رہے ہو ؟" بیوی دوپٹہ کا آنچل سنبھالتے ہوئے بولی :-

بیگم ۔ "بس اب مجھے "خانصاحب" ہی سمجھو"

ورنہ میری فہرست صاحب بہادر کے ملاحظہ میں گزرنے کی دیر ہے۔ خانصاحب

نے حقہ میں کش لگاتے ہوئے کہا۔

"خانصاحب" تو تم ہو ہی۔ یہ ہوا ہی سمجھ کیا بات ہوئی ... کیسی بے جوڑ سی باتیں کر رہے ہو آج تم"! .... بیوی نے چوکی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

ارے تم کچھ نہیں جانتیں، ہمارے باپ چونکہ پٹھان تھے، اور ہم اُن کے بیٹے ہیں اسلئے لوگ ہم کو خانصاحب، خانصاحب کہتے ہیں لیکن اب سرکار کی طرف سے ہم کو "خانصاحب" کا خطاب ملے گا، ہمارا نام اخبار میں چھپے گا۔ دربار میں ہم کو کرسی ملا کرے گی سمجھیں بیگم! آج کی رات بڑی ہی مبارک ہے" خانصاحب بیوی کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولے

"خانصاحب" کے ساتھ کچھ جائیداد اور وثیقہ بھی ملے گا یا خالی خطاب ہی ملیگا .... بیوی نے کہا۔

"بھئی تم بہت بھولی ہو، انگریزی خطابوں کے ساتھ کہیں جائیداد اور روپیہ پیسہ ملا کرتا ہے، اور ہاں! تم نے کیا .... "خانصاحب" کے خطاب کو معمولی سمجھ رکھا ہے۔ ہمارے محلہ کے سید اشفاق علی صاحب نے اس خطاب کے پیچھے کئی ہزار روپے خرچ کئے جب کہیں جا کر خطاب ملا، وہ بھی کئی سال کی امیدواری کے بعد۔ یہ خطاب بہت بڑی عزت ہے اور عزت کے سامنے روپیہ پیسہ کی کیا حقیقت ہے" خانصاحب نے بھڑک کر جواب دیا۔

"تو ایسے خالی، خولی خطاب کو لے کر کیا ہم شہد لگا کر چاٹیں گے۔ ہمارے دادا کو واجد علی شاہ کے یہاں سے خطاب ملا تھا تو اس کے ساتھ پانسو روپے مہینہ کا وثیقہ بھی مقرر ہوا تھا۔ ایسا خطاب ہمارے کس کام کا، لاؤ مجھ سے کہو، ایسے لاکھ خطاب میں

تمہیں دے دوں۔۔۔۔ بیوی نے اپنی ٹھوڑی سہلاتے ہوئے کہا۔

بیوی کی باتوں پر خانصاحب "تاؤ" کھا کر رہ گئے۔ اور غصہ کا اظہار اس لئے نہیں کیا کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ عورت چونکہ ناقص العقل ہوتی ہے اسلئے ان کی بیوی کو ناسمجھی کی باتیں کرنی ہی چاہیئں تھیں۔ دوسرے دن خانصاحب نے اپنی "خانہ ساز" فہرست دفتر میں داخل کر دی۔ تیسرے دن فہرستوں کی جانچ ہوئی۔

گذشتہ مردم شماری میں پورے قصبہ کی آبادی اٹھارہ ہزار کے قریب تھی۔ اور خانصاحب نے صرف ایک محلہ کی آبادی کو بیالیس ہزار بتلایا۔ افسر متعلقہ نے خانصاحب کو چپڑاسی بھیجکر طلب کیا۔ خانصاحب چپڑاسی کے آتے ہی سمجھ گئے کہ ان کی کارکردگی سے افسر متعلقہ خوش ہو گئے ہیں۔ اور خوشنودی کے اظہار اور خدمات کے اعتراف کے لئے ہی ان کو بلایا گیا ہے۔ خانصاحب نے چپڑاسی سے کہا کہ تم چلو میں ابھی آتا ہوں۔ چپڑاسی کے جانے کے بعد خانصاحب نے وہی جوڑا زیب تن فرمایا۔ جو اپنی شادی کے موقعہ پر پہنا تھا۔ خانصاحب کا یہ جوڑا بہت ہی خاص خاص موقعوں پر نکلتا تھا۔ اس بھڑکیلے اور رنگین جوڑے کو پہن کر خانصاحب اچھے خاصے "سرکس" بن کر رہ گئے۔ خانصاحب نے جوڑا پہن کر سرمہ لگایا اور کئی بار جھک جھک کر کپڑے شریف کو دیکھا۔ اور بیوی کو اپنے ناز و انداز اور سج دھج دکھانے کے لئے بے تکے سوالات کرنے شروع کر دیئے۔

خانصاحب شادی کا جوڑا پہن کر کلکٹری کچہری پہنچے اور مردم شماری کے افسر کے دفتر پہنچکر ٹھہر گئے۔ چپڑاسی نے خانصاحب کو دیکھتے ہی اندر جاکر اطلاع کی۔

اندر سے واپس آکر خانصاحب کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔

خانصاحب نے کمرے کی چک قدرے گھبرا کر اٹھائی۔ چک کی تیلیوں میں اُن کی شیروانی اُلجھ گئی۔ انہوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو چلمن نے دامن تھام لیا۔ چپراسی نے دوڑ کر چلمن سے ان کی شیروانی کو نکالا اور ہمارے خانصاحب نے عہدہ دار کو جھک کر سلام کیا۔

تمہارا کیا نام ہے؟ ... عہدیدار خانصاحب کو خوب غور سے دیکھتے ہوئے بولا

میرا نام (خانصاحب پہلے کھانسے) اشرف خانصاحب ہے۔

یہ فہرست تمہاری ہی مرتب کی ہوئی ہے ....

جی ہاں! یہ فہرست کمترین ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ خانصاحب نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

یہ تم نے اپنے ایک محلہ کی آبادی ، بیالیس ہزار بتائی ہے۔ پورے قصبہ کی آبادی تو اس تعداد کی آدھی سے بھی کم ہے۔

جی ہاں! ہمارے محلہ کی اتنی ہی آبادی ہے۔ فدوی نے جو کچھ لکھا ہے بالکل ٹھیک اور درست ہے۔ خانصاحب نے ٹوپی چھوتے ہوئے جواب دیا۔

تو تم نے سرکار کے ساتھ مذاق کیا ہے۔ جب ایک محلہ کی آبادی بیالیس ہزار ہے تو اس پورے قصبہ کی آبادی کئی لاکھ ہو گی۔ عہدیدار نے تیزی کے ساتھ کہا۔

ہوسکتی ہے ، کیا تعجب ہے ، ممکن ہے ، یقین کیا جا سکتا ہے ، امکانات ہیں .. خانصاحب نے بہت ہی سنجیدہ بنکر جواب دیا۔

تم کیسی نشہ بازوں کی سی باتیں کر رہے ہو معلوم ہوتا ہے کہ تم نے گھر بیٹھ کر یہ فہرست
ٹ کی شنٹ اور ساوٹ پٹا تمسک لکھوا لی ہے۔

عہدیدار نے آخری جملہ غصہ میں بغیر کسی خاص احساس اور فکر کے کہہ دیا تھا۔
ر، جو کسی نے کہا ہے کہ چور کے کتنے پاؤں ہوتے ہیں، تو خانصاحب کو یقین ہو گیا کہ عہدیدار کو
کسی نہ کسی طرح اس کی خبر ہو گئی کہ میں نے فہرست گھر بیٹھ کر مرتب کی ہے۔

کیا سوچ رہے ہو، جواب کیوں نہیں دیتے۔ عہدیدار نے جھلا کر کہا۔

کیا کہتے حضور ہی سمجھ کے ... یا جب ہی تو حضور کو یہ عہدہ ملا ہے۔

ہاں میں نے گھر بیٹھ کر اس فہرست کو لکھا ہے۔ بات یہ ہے کہ اپنے محلہ والوں
و میں خوب جانتا ہوں، اسلئے گھروں پر جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اور پھر گھر بیٹھ کر
م بھی اچھا ہو سکتا ہے۔

خانصاحب کا جواب سُنکر عہدیدار کا چہرہ غصّہ کے مارے سُرخ ہو گیا۔ اس
نے چپراسی کو آواز دے کر کہا:۔

"چپراسی! اس اُلو کو ہمارے کمرے سے فوراً باہر نکال دو"

اُدھر چپراسی دوڑا اور اِدھر خانصاحب بھاگے۔ کمرے کے دروازے میں دونوں
کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ چپراسی نے خانصاحب کے کاندھوں کی طرف ہاتھ بڑھائے ہی تھے
خانصاحب اس پھرتی سے چپراسی کی گرفت سے نکلے کہ چپراسی ہاتھوں کو دیکھتا ہی
گیا ... خانصاحب کلکٹری کچہری سے بھاگ کر سیدھے گھر آئے۔ ماتھے سے پسینہ
ٹپ ٹپ گر رہا تھا۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔

"یہ تمہیں کیا ہوا، خیر تو ہے! بیوی نے گھبرا کر پوچھا۔۔۔۔

خانصاحب نے بیوی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ صحیح بات بتاتے تو ندامت اور خفت ہوتی۔ اس لئے بیوی کو بے وقوف بنانے کے لئے ان کا دماغ کوئی افسانہ تراشنے لگا۔ کچھ دیر سوچ بچار کے بعد خانصاحب نے فرمایا۔

یہ ڈپٹی کلکٹر بڑا ہی متعصب اور تنگ نظر ہے، میری داڑھی کو دیکھ کر کہنے لگا کہ یہ گھانس تم نے کیوں رکھ چھوڑی ہے۔ مجھے اس پر تاؤ آگیا۔ اور اس کو دو ملاحیاں سنائی ہیں کہ یاد ہی کرتا ہوگا۔۔۔ وہ تو خیر گذری کہ گھر سے چھڑی لے کر نہیں گیا تھا۔ ورنہ اس کی گنجی کھوپڑی پر نقارے بجا دیتا۔

کچہری سے واپس ہوا تو حلوائیوں کے بازار میں آکر میں نے سبانی پیا۔ اور ایک آنہ کی جلیبیاں مول لیں۔ میں جلیبیوں کا دونا ہاتھ میں لے کر چلا ہی تھا۔ ایک موٹے سے کتے نے میرا پیچھا کیا۔ اور محلہ کی گلی کے نکڑ تک ظالم نے پیچھا نہ چھوڑا۔ کتے نے تیور بدلے ہوئے تھے۔ میں نے یہ حالت دیکھ کر جلیبیوں کا دونا پھینک دیا۔ اور وہاں سے بھاگتا ہوا گھر چلا آیا۔

خانصاحب کے یار دوستوں کو جب اس قصہ کا علم ہوا تو بہت دنوں تک یہی قصہ ان کی تفریح کا موضوع بنا رہا۔ یار لوگوں نے بھی خانصاحب کو باور کرا دیا کہ ڈپٹی کلکٹر نے مذہبی تعصب کے سبب سے خانصاحب کے ساتھ ایسا سلوک کیا، اور پٹی صاحب اپنے کسی عزیز کو مردم شماری کی کارگذاری کا انعام دلوانا چاہتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک فوجداری کے مقدمہ میں ہمارے خانصاحب گواہ کی حیثیت

سے پیش ہوئے اور ہاں! پیش کیا ہوئے، بلکہ انھوں نے اصرار کر کے اپنا نام گواہوں کی فہرست میں لکھوایا۔ اور مدعا علیہ کو باور کرا دیا کہ وہ مقدمہ بازی کے فن میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اور مشق سے مشاق وکیل بھی اُن کو جرح میں نہیں اُکھاڑ سکتا ... مدعا علیہ کے وکیل نے خانصاحب کو حسب معمول کچھ اشارات بتائے۔ مگر خانصاحب نے اس پر ارشاد فرمایا۔

"یہ آپ نے کیا مجھے مدرسہ کا لونڈا سمجھ رکھا ہے جو سبق پڑھانا شروع کر دیا۔ وقت آنے دیجئے سب کچھ کہہ دیا جائے گا۔"

مقدمہ کی پیشی پر خانصاحب کچہری پہنچے۔ مدعا علیہ نے خانصاحب کی بہت زیادہ خاطر و مدارات کی۔ خانصاحب وکیل کے بستہ پر اس طرح ڈٹ کر بیٹھ گئے۔ جیسے اس کچہری کے تمام وکیل اور مختار، اُن کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کر چکے ہیں۔ خانصاحب کے سامنے سے جو خوانچے والا نکلتا، اس سے کچھ نہ کچھ چیز ضرور مول لیتے وہ جو کسی نے کہا ہے ... کہ حلوائی کی دوکان دادا جی کا فاتحہ تو ہمارے خانصاحب نے آج اسی ضرب المثل پر پورا عمل شروع فرما دیا تھا اُن کی خاطر سے کیا جاتا تھا تمام چیزیں مدعا علیہ کے سر پڑ رہی تھیں، نارنگیاں، ناشپاتی، کیلے، چنے، مرمرے، بیسن کے لڈو، گنڈیریاں، شکر قندی غرض خانصاحب نے آج تھوڑی سی دیر میں تمام چیزوں کا مزہ لے کر چھوڑا۔

خانصاحب گنڈیریاں چوس ہی رہے تھے کہ چپراسی نے کڑک کر اُن کا نام پکارا۔ اور وہ اس طرح گھبرا کر بھاگے کہ ایک گنڈیری اُن کے ہاتھ میں تھی، اور وہ گنڈیری جس کو وہ

تو کرن سنگھ نے علی احمد کو لکڑی دکھا کر کہا تھا کہ اگر تم نے گالی دی تو سر توڑ ڈالوں گا۔ وکیل نے دریافت کیا۔

کہا تھا۔ ضرور کہا تھا۔ لکڑی بھی دکھائی تھی۔ اور آنکھیں بھی نکالی تھیں . . . . .

خانصاحب نے ارشاد فرمایا۔

اچھا . . . ! ابھی آپ نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ کرن سنگھ کے پاس صرف ایک چھوٹی سی لکڑی تھی۔ چاقو نہیں تھا تو ان دونوں بیانوں میں سے آپ کا کونسا بیان سچا ہے۔

وکیل کوٹ کا کالر کھینچتے ہوئے بولا۔

دونوں بیان سچے ہیں، کیا آپ نے مجھے جھوٹا اور لفنگا سمجھ رکھا ہے۔ جو ایسے سوالات آپ کئے جا رہے ہیں۔ اجی! اسوقت بات یاد نہیں آئی تھی اب یاد آ گئی۔

خانصاحب کے اس بیان پر وکیل نے عدالت سے پُرزور احتجاج کیا اس پر عدالت نے خانصاحب سے کہا کہ آپ باہر تشریف لے جائیے۔ چپراسی نے دوسرے گواہ کا نام خوب زور سے چیخ کر پکارا۔ خانصاحب نے کچہری سے واپس آکر اپنے دوستوں سے کہا۔ کہ آج تو کچہری میں وہ گواہی دے کر آیا ہوں کہ مجسٹریٹ وکیل اور تمام آدمی دانتوں میں انگلیاں دینے لگے۔

ایک دفعہ خانصاحب نے بھرے مشاعرے میں غالب کی غزل "اشرف" تخلص لگا کر سنادی۔ یار لوگوں نے خوب داد دی۔

کیا کہنے ہیں خانصاحب کے قسم خدا کی غالب کی زبان بول رہے ہیں۔

واہ حضرت اشرف۔ سبحان اللہ! غالب کے بعد آپ ہی کا درجہ ہے۔

ماشاء اللہ! پوری غزل از اول تا آخر غالب کے رنگ میں فرمائی ہے۔

خانصاحب نے اس طنزیہ داد پر جھک جھک کر آداب کیا اس انداز کے ساتھ کہ یہ غزل سچ مچ انہی کی تراوش فکر کا نتیجہ ہے۔ اور یہ تمام لوگ غزل سے مرعوب ہو کر بے ساختہ داد دے رہے ہیں۔ ایک صاحب نے جو خانصاحب کی خصوصیات سے واقف تھے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا کہ یہ غزل تو شاید مرزا اسداللہ خاں غالب کے دیوان میں موجود ہے۔ اس پر خانصاحب بگڑ کر بولے غالب بھی آدمی تھا کوئی فرشتہ نہ تھا۔ ہم بھی آدمی ہیں کیا ہم اس جیسی غزل نہیں کہہ سکتے۔ اگر ہماری کہی ہوئی غزل غالب کے دیوان میں موجود ہے تو ہوا کرے تو کیا ایک شاعر کا خیال دوسرے شاعر کے خیال سے لڑ نہیں جاتا ... ! اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

ایک مرتبہ خانصاحب کو ایک دوست کے نکاح میں گواہ بنایا گیا جب قبول و ایجاب کا وقت آیا تو دولہا کے بجائے آپ نے بے ساختہ فرما دیا۔

- قبول کی میں نے ...

بات تو تھی بہت زیادہ دلچسپ لیکن موقعہ محل کا لحاظ کرتے ہوئے لوگوں نے برا مانا۔ اور بعض لوگوں نے خانصاحب سے کہا بھی کہ آپ بعض وقت بہت زیادہ عقلمند بن جاتے ہیں۔ یہ آپ دوسرے کی بیوی کو قبول کرنے کے لئے کس طرح تیار ہو گئے۔ اس پر خانصاحب نے فرمایا بھئی یہ ہمارا دوست کلیم (دولہا کا نام) قاضی کے سوال پر خاموش رہا۔ بس پھر مجھ سے نہ رہا گیا، میرے منہ سے بے ساختہ - قبول کی میں نے نکل گیا۔

ایک مرتبہ خانصاحب کے محلہ میں کسی کی شادی تھی۔ بیٹی اور بیٹے والا دونوں خوشحال تھے۔ شادی کی تقریب کے انتظامات بہت دھوم دھام کے ساتھ کیے گئے۔ آتشبازی۔ انگریزی باجہ، انتقال طوائفیں، غرض وہ تمام اسباب اس شادی میں موجود تھے۔ جن سے طرفین کی بے پناہ مسرت کا پتہ چلتا تھا۔

بیٹی والے نے ناچ گانے کی محفل کے لئے بڑے سلیقہ سے اپنا مکان سجایا تھا ہمارے خانصاحب بھلا ایسے سہرے اور رنگین موقع کو کہیں چھوڑنے والے تھے وہ جب محفل میں بن سنور کر پہنچے ہیں تو ایک نوخیز طوائف بالکل جنگل کے مور کی طرح ناچ رہی تھی۔ خانصاحب کو دیکھتے ہی لوگوں نے کہا۔

"آئیے خانصاحب! تشریف لائیے! یہاں بیٹھئے۔ آپ ہی کی کمی تھی"

خانصاحب، قالین پر گاؤ تکیہ کے سہارے اس انداز سے بیٹھے کہ گویا اس جلسہ کے یہ بلا مقابلہ پریسیڈنٹ منتخب ہو گئے۔ خانصاحب نے طوائفوں کو دل کھول کر داد دی، خانصاحب ایک ایک شعر کے کئی کئی مرتبہ گائے جانے کی فرمائش کرتے اور اس طرح جھومتے جیسے جاپان کے کھلونے میں کوئی چابی بھر دیتا ہے تو وہ ایک خاص ترتیب کے ساتھ جھومتا ہے۔

شادی کی تقریب ختم ہونے کے بعد یار لوگوں نے خانصاحب کو بنانے کے لئے خانصاحب سے کہا کہ وہ چھوٹی عمر کی طوائف جس کا نام مشتری ہے، آپ کو بہت گھور کر دیکھ رہی تھی۔ خانصاحب اس پر قدرے شرما کر مسکرائے اس انداز سے گویا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو، وہ بالکل صحیح ہے۔ ایک شخص کے چند دن کے بعد خانصاحب

سے کہا۔ کہ میں مشتری کے یہاں گیا تھا وہ آپ کو یاد کر رہی تھی۔ خانصاحب کو اب پورا یقین ہو گیا کہ مشتری اُن کی محبت کے تیر سے سچ مچ گھائل ہو چکی ہے۔ خانصاحب کے دوست آپس میں مشورہ کر کے ایک پُرلطف اسکیم مرتب کر چکے تھے۔

ایک دن خانصاحب کو مشتری کے مکان لیجایا گیا۔ دوستوں نے مشتری کو پٹی پڑھا دی کہ ایک بے وقوف آ رہا ہے، تم اُسے خوب بنانا۔

خان صاحب بن سنور کر مشتری کے یہاں پہنچے۔ مشتری نے خانصاحب کی بہت کچھ آؤ بھگت کی۔ اور اپنے ناز و انداز سے یہ بات ثابت کر دی کہ اس کے دل میں خانصاحب کی محبت گھر کر گئی ہے۔ خانصاحب مشتری کے التفات کو دیکھ کر ریشۂ خطمی ہوئے جاتے تھے۔ اور تن تن کر دیوار میں لگے ہوئے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھتے

مشتری کا ناک نقشہ بھی اچھا تھا۔ رنگ اگرچہ گندمی تھا۔ لیکن جسم کے تناسب اور جوانی نے اس کو بہت زیادہ جاذبِ نظر اور دلکش بنا دیا تھا۔ خانصاحب کو زندگی بھر میں یہ پہلا موقع ملا تھا۔ اُن کے دل و دماغ پر بس مشتری ہی چھائی ہوئی تھی ... اور وہ مشتری کے یہاں جانے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے ... ایک رات کو خانصاحب کی بیوی نے دیکھا کہ خان صاحب مثنوی زہرِ عشق کو پڑھ پڑھ کر رو رہے ہیں۔ دو چار مرتبہ خانصاحب کے دوست اُن کو مشتری کے یہاں لے کر گئے اور اس کے بعد چند دن کے لئے آنا جانا موقوف ہو گیا۔

ایک دن دوستوں کی محفل میں کسی نے خانصاحب سے بالکل مذاقیہ طور پر پوچھا کہ مشتری آپ سے شادی کرنا چاہتی ہے کیا آپ اس کے لئے تیار ہیں۔ خانصاحب

نے مشتری سے نکاح کرنے کے لئے فوراً حامی بھر لی، اور مسکرا کر بولے "نیکی اور پوچھ پوچھ" ایک دوست نے کہا کہ میاں خانصاحب کی بیوی تو خدا کے فضل سے زندہ ہیں۔ وہ پہلی بیوی پر سوکن لا کر نہیں بٹھائیں گے۔ اس پر خانصاحب کڑک کر بولے:۔ اسلام میں تو چار شادیاں جائز ہیں اور ہمارے دادا کے بھائی کے تو تین بیویاں تھیں ہمارے بڑے ماموں نے بھی دو شادیاں کی تھیں۔ اس میں برائی کی کیا بات، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ طوائف سے شادی کرنے میں بہت بڑا ثواب ہے۔ وہ غریب بڑے کاموں سے بچ جائے گی۔

مشتری (طوائف) کے یہاں ایک ادھیڑ عمر کا شخص "فخرو" ملازم رہتا تھا، خانصاحب کے دوستوں نے اُسے اس بات پر راضی کیا کہ وہ زنانہ لباس پہن کر بیٹھ جائے۔ اور جب خانصاحب کوئی دست درازی کریں تو اُن کی اچھی طرح مرمت کردے۔ تمام ضروری اور مناسب انتظامات کے بعد خانصاحب کے نکاح کی تاریخ مقرر ہوئی، دوستوں نے خانصاحب سے کہا کہ بھئی! خانصاحب! مشتری نو عمر اور شوقین لڑکی ہے آپ کو داڑھی صاف کرانا پڑے گی۔ خانصاحب اس کے لئے فوراً تیار ہوگئے اور داڑھی کا صفایا کرادیا۔

خانصاحب نے روز مقررہ پر بڑے زرد کا جوڑا زیب تن فرمایا اور اپنے دوستوں کی بارات لے کر مشتری کے یہاں پہنچے۔ خانصاحب کی بیوی نے خانصاحب سے جاتے وقت پوچھا کہ آج اس قدر بن سنور کر کہاں جارہے ہو، خانصاحب نے بڑی بے اعتنائی کے ساتھ جواب دیا کہ ایک دوست کے یہاں شام کو دعوت ہے سب باہر کے مہمان بھی آئے ہوئے ہیں۔

خانصاحب فخری کے مکان پر پہنچے اور قالین پر اس طرح آنکھیں نیچی کر کے بیٹھ گئے۔ جیسے سچ مچ یہ دولہا ہی ہیں۔ اور سسرال میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک دوست قاضی بنا اور دو دوستوں نے گواہوں کے فرائض انجام دیئے۔ ایجاب و قبول ہوا۔ خانصاحب کے گلے میں ہار ڈالے گئے۔ فخری کی نانی نے کہا، کہ ہمارے یہاں قاعدہ ہے کہ میکے ہی میں دلہن کی رونمائی ہوتی ہے۔ خانصاحب نے اسپر آہستہ سے۔ گردن ہلا دی۔ خانصاحب کو اس کمرے میں بھیجا گیا۔ جس میں فخرو زنانہ لباس پہنے بیٹھا تھا۔ خانصاحب کو تو فرطِ مسرت نے بالکل بدحواس بنا دیا تھا۔ وہ اپنی مصنوعی دلہن کو آغوش میں لینے والے ہی تھے کہ فخرو نے ایک لات جو رسید کی ہے تو خانصاحب اوندھے منہ گر پڑے

"بیگم... یا کیا کرتی ہو..."

خانصاحب نے کہا..... اس پر فخرو نے دوپٹہ اتار کر پھینک دیا اور خانصاحب کو ٹانگوں کے نیچے دبا کر وہ درگت بنائی ہے کہ خانصاحب پناہ مانگنے لگے۔

خانصاحب پٹ پٹا کر گھر آگئے۔ بیوی نے پوچھا، کہو دعوت کیسی رہی؟ آج تمہارا چہرہ بہت بے رونق ہو رہا ہے۔ خانصاحب نے جواب دیا کہ دعوت میں کھانے بہت ثقیل تھے۔ میری طبیعت بھاری سی ہے۔ میں سو جانا چاہتا ہوں۔

خانصاحب کا سفر!

مزاحیہ افسانہ

ہمارے دوست "خانصاحب" کو میلوں ٹھیلوں میں جانے کا بہت شوق تھا۔ مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ "ملا کی دوڑ مسجد تک" تو ہمارے خانصاحب بھی اپنے گاؤں کے آس پاس کے میلوں، تماشوں اور بازاروں میں جا کر دِل بہلاتے تھے۔ سال میں ایک دفعہ راج گھاٹ میں کاتکی اشنان کا میلہ لگتا تھا اور یہ میلہ خانصاحب کے ذوقِ سیاحت کی معراج تھی۔ خانصاحب کی "بارگاہِ حماقت" میں ہم بہت زیادہ بے تکلف ہو گئے تھے۔ اس لئے ہم نے علی گڑھ کی نمائش میں چلنے کے لئے خانصاحب کو ابھارا... "یہ نمائش کیا چیز ہوتی ہے" خانصاحب نے مونچھوں پر تاؤ دے کر فرمایا

جبھی خانصاحب! آپ جیسا جہاندیدہ شخص ایسی بات ۔۔۔۔ دریافت کرتا ہے، ۔ نمائش" کا نام کیا آپ نے آج ہی سنا ہے ۔۔۔۔ ہم نے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

اسپر خانصاحب نے سر ہلاکر بلا ارادہ کئی مرتبہ کھانسا۔ ہم نے خانصاحب کی دکھتی ہوئی رگ پر نشتر لگایا تھا اور اب خانصاحب کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ۔۔"نمائش" کے متعلق کچھ پوچھتے۔ پوچھنے میں خانصاحب کی ہمہ گیری، جامعیت، جہاندیدگی اور ان کے ہر فن مولا ہونے کی خصوصیت پر حرف آتا تھا۔

ہمیں سب معلوم ہے! ہم نے تو یونہی چھیڑنے کے لئے کہ دیکھیں تم کتنے پانی میں ہو۔ ۔۔۔ یہ بھی پوچھ لیا تھا۔ مگر ہاں! بھئی یہ تو بتاؤ کہ اس میں خرچ کتنا ہوگا ۔۔۔ خانصاحب نے کہا۔

خانصاحب! آپ خرچ ورچ کی طرف سے بالکل مطمئن رہیں۔ جتنے روپے کا آپ آسانی کے ساتھ انتظام فرما سکیں فرمالیں، باقی کا اللہ مالک ہے ۔۔۔ ہم نے جواب دیا۔

ہماری اس گفتگو کے بعد خانصاحب نے "حامی" بھر لی اور علیگڈھ جانے کی تیاری میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔

خانصاحب نے تمام گاؤں میں اس خبر کو پھیلا دیا کہ وہ نمائش دیکھنے کے لئے علیگڈھ جارہے ہیں۔ خانصاحب نے اپنے تمام کاروبار نمائش دیکھ کر آنے تک کے لئے ملتوی کردیئے تھے۔ زمیندار کا کارندہ لگان وصول کرنے کے لئے آیا، خانصاحب نے اس سے کہہ دیا، کہ بھئی علیگڈھ کی نمائش ختم ہوجانے کے بعد آنا۔ بیوی نے کہا کہ مکان کی

بہت دِن سے مرمت نہیں ہوئی، پچھلی برسات میں تو جیسے تیسے گذر ہو گئی تھی، مگر اب کی برسات میں خدا ہی حافظ ہے۔ اس پر خانصاحب نے کہا کہ اب جو کچھ بھی کام ہوگا، علی گڈھ کی نمائش کے بعد ہوگا۔ خانصاحب کی جائیداد کا بٹوارہ ہونے والا تھا۔ حصّہ داروں نے کہا کہ ہم بٹوارے کے امین کو بلا کر لاتے ہیں۔ خانصاحب نے فرمایا کہ بھئی! نمائش سے واپس آنے تک میں کچھ نہیں کر سکتا، میں ہر کام اطمینان اور جمعیتِ خاطر کے ساتھ کرتا ہوں، میرا دل تو نمائش میں پڑا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں زمین اور جائیداد کے معاملات میرے بس کے نہیں!

خانصاحب گاؤں کی جس چوپال اور بیٹھک میں جاتے، نمائش کا ذکر ضرور نکالتے لوگوں کو ایک نیا مذاق ہاتھ آ گیا تھا۔ وہ خانصاحب کو زیادہ اُکسانے کے لئے نمائش کے متعلق سوالات کرتے، اور خانصاحب اس طرح جواب دیتے جیسے نمائش انہی کے حکم سے منعقد ہوئی ہے، اور یہ اس کی ایک ایک بات سے واقف ہیں۔ خانصاحب نے درزی کو کپڑے سلنے کے لئے دے دیئے تھے، اور دِن میں کئی کئی مرتبہ درزی سے جا کر کہتے۔۔۔ بھیا کشوری! بس اب علی گڑھ جانے میں چھ دن باقی رہ گئے ہیں۔ کپڑے جلدی تیار کر دو۔ بھیا معاف کرنا درزیوں اور سناروں کے وعدے قیامت کے وعدے ہوتے ہیں، ایسا نہ ہو کہ تم وقت پر کہدو کہ خانصاحب! بس ذرا شیروانی کے کاج اور کُرتہ کا گریبان باقی رہ گیا ہے۔

خانصاحب کی نمائش کی تیاری نے بیچارے گھر والوں کا ناک میں دَم کر دیا تھا۔ دِن میں کئی کئی مرتبہ ٹرنک میں کپڑے لگائے جاتے، بستر باندھا جاتا، اس "ریہرسل"

(یعنی مشتاق) نے گھر کے لوگوں کو بیٹھے بٹھائے جنجال میں ڈال دیا تھا۔ صبح کو روانہ سفر کی ناشتہ کے لئے گفتگو ہوتی اور خانصاحب عجیب عجیب طرح سے پینترے بدل بدل کر تنقید فرماتے۔

بیسنی روٹی تو قبض کرتی ہے، گھی کا ہاتھ لگا کر خمیری روٹیاں پکا دینا۔
اور ہاں! آلو کا بھرتا خوب چٹپٹا ہونا چاہیے۔ ہرا دھنیہ خوب ڈالنا
شامی کباب ضرور ہونے چاہئیں، سرکہ کا آچار بھی رکھ دینا...
دہی کی بھی کوئی چیز ضرور تیار کرانا۔ دیکھو اس بات کا خیال رہے
ریل کا سفر ہے، ثقیل چیزوں سے قبض ہو جاتا ہے۔ سیرکرس کا معاملہ
ہے کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو مصیبت آ جائے گی...

خانصاحب نے علیگڈھ چلنے سے ایک دن قبل خضاب لگایا اور دن بھر گھر میں بیٹھے رہے۔ علی گڈھ کو گاڑی دن کے ساڑھے نو بجے جاتی تھی۔ مگر خانصاحب صبح چار بجے میرے یہاں پہنچے، اور دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا۔ میں خوب گہری نیند سو رہا تھا بیوی نے جگایا کہ کوئی بھڑ بھڑ دروازے کو پیٹ رہا ہے، خدا خیر کرے، نہ جانے کیا معاملہ ہے۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھا، اور دروازہ کھول کر جو دیکھتا ہوں تو خانصاحب کھڑے ہوئے ہیں... خانصاحب خیر تو ہے... میں نے گھبرا کر پوچھا ... خدا کا فضل ہے، آپ کی دعا ہے، میں تو میاں منظور! تم کو جگانے کے لئے آیا ہوں، آج علی گڈھ چلنا ہے... خانصاحب نے فرمایا۔
مگر خانصاحب! ٹرین تو نو بجے چھوٹتی ہے، اتنے سویرے اٹھنے کی کیا ضرورت

ہے ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔۔ ارے میاں ! یہ بیل گاڑی نہیں ہے ۔ ریل گاڑی ہے ریل گاڑی، کبھی ریل کا سفر بھی کیا ہے ۔ آپ نے ! نہانا دھونا ہے سامان باندھنا ہے ناشتہ تیار ہوگا ۔ پھر اسٹیشن پر پہنچکر ٹکٹ لینا ہے، اتنے بہت سے کاموں کے لئے آخر کچھ وقت تو چاہیئے ۔۔۔۔ خانصاحب نے تن کر جواب دیا ۔

خانصاحب کی حماقت پر مجھے بہت غصہ آیا کہ خدا کے بندے نے بلا وجہ اٹھا دیا مگر غصہ کے ساتھ ہی فوراً خیال آیا کہ اگر ایک لفظ بھی ہم نے خانصاحب کی شان میں سخت کہہ دیا تو پھر اس ابوالہول کو منانا مشکل ہو جائیگا ۔ اسلئے خفگی کو چھپاتے ہوئے میں نے خانصاحب سے کہا کہ آپ اطمینان رکھئے آٹھ بجے تک میں بالکل تیار ہو جاؤں گا ۔ آپ بھی تیار رہیئے، اس پر خانصاحب نے فرمایا ۔

میں تیار ہوں ۔ خوب ! ابھی میں تو کئی دن سے تیار ہوں، بستر بندھا ہوا رکھا ہے ۔ گھر کی عورتوں کو میں نے ایک بجے اٹھا دیا ہے وہ ناشتہ تیار کر رہی ہیں ۔ ابھی ابھی میں شامی کبابوں اور پراٹھوں کی بانگی دے کر آیا ہوں بس ذرا کپڑوں کا ٹرنک درست ہونا باقی ہے، اس درزی کے بچے کستوری نے کرتہ کا گریبان الٹا لگا دیا ۔ آج صبح اس نے کرتہ دینے کا وعدہ کیا ہے ۔ میں یہاں سے اسی کے یہاں جا رہا ہوں ۔۔

میں پھر بستر پر جا کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر کے بہت کچھ سونے کی کوشش کی، مگر نیند نہ آئی، میں دل ہی دل میں خانصاحب کو برا بھلا کہتا رہا ۔ میں کروٹیں بدل ہی رہا تھا کہ قریب کی مسجد سے اذان کی آواز آئی، اور میں اٹھ بیٹھا ۔ دھوپ پھیلنے تک میں تمام ضرورت سے فارغ ہو گیا ۔ علی گڈھ میرے گاؤں سے تیس میل کے فاصلہ

پڑتا، ایک گھنٹہ کا سفر تھا۔ اور وہاں زیادہ سے زیادہ تین چار دن رہنا تھا۔ اتنے مختصر سفر کے لئے کسی خاص تیاری کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے بستر لپیٹا، بیوی نے دو تین جوڑے کپڑے ٹرنک میں رکھ دیئے اور ماما نے ناشتہ پکا دیا، خانصاحب نے اس عرصہ دو چکر تو میرے مکان کے خود کئے اور کئی مرتبہ اپنے لڑکے کی معرفت کہلا بھیجا۔ ۔ ۔ ۔ سامان لے کر۔ ۔ ۔ میرے مکان پر آجاؤ وہاں سے اسٹیشن چلیں گے۔

خانصاحب کے تقاضوں نے پریشان کر دیا تھا۔ میرا ارادہ نو بجے سیدھا اسٹیشن پہنچنے کا تھا۔ مگر اس بندۂ خدا کے تقاضوں سے تنگ آکر آٹھ بجے کے اس کے یہاں پہنچ گیا۔ میں خانصاحب کے دیوانخانہ میں جا کر بیٹھ گیا۔ جہاں خانصاحب کی باتوں کی صاف آواز آرہی تھی۔ خانصاحب گل افشانی فرما رہے تھے۔

بھئی ان عورتوں کو خدا سمجھے، ہر کام میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کرتی ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ تمباکو خمیرہ، کاغذ میں لپیٹ کر ٹرنک میں رکھ دینا، اور انہوں نے خرجی میں رکھ دیا۔ اور ہاں! پان تو اب لگائے جا رہے ہیں۔ جیسے ہمیں شام کی گاڑی سے جانا ہے اگر تھوڑی دیر میں پانوں کی ڈبیہ تیار نہ ہوگئی تو قسم کلام مجید کی پاندان اٹھا کر پھینک دوں گا۔ کئی دن سے کہہ رہا ہوں کہ دیکھو ہر چیز تیار کر رکھو، یہ نہ ہو کہ وقت کے وقت کام شروع ہو اور جلدی میں کچھ کا کچھ ہو جائے۔ مگر یہ عورتیں کسی کی سننے والی ہیں!

ساجدہ بیٹی! منجن کی ڈبیہ تو میری اچکن کی جیب میں ڈال دینا

یہ تیری ماں تو سٹھیا گئی ہے، ہم کچھ کہتے ہیں وہ کچھ کرتی ہے! اور ہاں کھانے کا تمباکو، بٹوے کی دونوں تہوں میں بھر دینا، میرے منہ کو یہی تمباکو لگا ہوا ہے۔ علیگڈھ میں یہ تمباکو نہ جانے ملے یا نہ ملے!

ارے! یہ بستر کس سگھڑ نے باندھا ہے لاحول ولا قوۃ۔

اور ہاں! حقہ کے کوئلے اتنے ذرا سے! یہ کوچار چلموں ہی میں ختم ہو جائیں گے۔ اچھا! میری پتلی رضائی بھی لپیٹ دی، اور ہاں! سوزنی تو دھوبی کے یہاں سے کسی نے منگائی ہی نہیں... عورتوں کا کام ہمیشہ خراب ہوتا ہے، لاکھ سمجھاؤ، تاکید کرو، مگر یہ کسی مردود کی سننے والی ہیں ان کو تو دن رات بکری کی طرح پان چبانے سے کام ہے، تمام دیواریں پیک تھوک تھوک کر لال کر دی ہیں۔

ناشتہ دان تو دیکھو! سبحان اللہ! سکندر کے زمانہ کا معلوم ہوتا ہے یہ ناشتہ دان! کسی خدا کے بندے کو دو پوریے لگانے کی توفیق نہیں ہوئی...

میں دیوانخانہ میں بیٹھا ہوا خانصاحب کی باتیں سن رہا تھا۔ اتنے میں خان صاحب کی ماما کا لڑکا نیم کی دو تین شاخیں ہاتھ میں لئے ہوئے مکان میں داخل ہوا۔

اب لایا ہے مردود نیم کے خلال...!

یہ کہتے ہوئے خانصاحب نے لڑکے کو دھم دھم پیٹنا شروع کیا۔ خانصاحب کی لڑکیوں نے نیم کی ڈالیوں سے سینکیں توڑ کر، ململ کے ایک ٹکڑے میں لپیٹ

کر خانصاحب کی اچکن کی جیب میں ڈال دیں۔ اب خانصاحب نے گھر والوں کو نصیحت کرنی شروع کی ......

حامد! دیکھو تم میرے پیچھے روزانہ مدرسہ جانا، یہ نہ ہو کہ دوستوں کے ساتھ جنگلوں میں مارے مارے پھرو۔ میں تمہارے لئے بستان اور موزے لے کر آؤں گا۔

ساجد! تمہارا بخار ابھی پوری طرح نہیں اترا، دیکھو بدپرہیزی نہ کرنا حکیم صاحب سے میں نے کہہ دیا ہے، وہ تم کو روز گھر آکر دیکھ جایا کریں گے بیٹا میں تمہارے لئے بہت سی چیزیں لے کر آؤں گا۔

ساجدہ! میرے پیچھے تم کسی کے یہاں آنا جانا نہیں! اپنی ماں کا کام میں ہاتھ بٹانا، تمہاری چھوٹی بہن کے دانت نکل رہے ہیں، تم اسکی ٹہل کرنا، تمہارے پیر کا ناپ میں نے لے لیا ہے، سلیم شاہی جوتیاں لاؤں گا، تم دیکھ کر خوش ہو جاؤ گی۔

اور ہاں! ساجد کی ماں! (اپنی بیوی سے) دیکھو! بچوں کی خبر رکھنا، مغرب کے بعد کسی کو باہر نہ جانے دینا، زمانہ خراب ہے، میں نے تمہارے بھائی سے کہہ دیا ہے، وہ روزانہ گھر میں آکر سو جایا کرے گا، کچہری دربار کا کوئی آدمی آئے تو کہہ دینا کہ خانصاحب نمائش دیکھنے کے لئے علی گڑھ گئے ہیں۔ میں علیگڑھ پہنچتے ہی خیریت کا خط بھیجوں گا گھبرانا نہیں! آج منگل ہے میں جمعہ کو نہیں تو سنیچر کو شام کی گاڑی سے

ضرور بالضرور آجاؤں گا، چار پانچ دن آنکھ میچتے گذر جاتے ہیں۔

یہ کہہ کر خانصاحب نے بچوں کے سروں پر شفقت کا ہاتھ پھیرا اور بہت دیر تک دعا پڑھتے رہے۔ جب ہمارے خانصاحب باہر آئے ہیں تو اُن کی سُرخ بھری آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ گھر سے اس طرح رخصت ہوئے، جیسے یہ میدان جنگ کو جا رہے ہیں۔ خانصاحب نے چلتے وقت اپنے مکان کو کئی مرتبہ مڑ کر دیکھا خانصاحب کا سامان دو آدمی اُٹھائے ہوئے تھے۔ میں اپنا سامان اسٹیشن بھیج چکا تھا۔ خانصاحب گاؤں کی گلیوں میں اس طرح تن تن کر چل رہے تھے، جیسے یہ کسی قلعہ کو فتح کرنے کے لئے جا رہے ہیں۔ خانصاحب کے ساتھ گاؤں کے بہت سے لڑکے ہو لئے لڑکے اشاروں ہی اشاروں میں خانصاحب پر پھبتیاں کس رہے تھے اور خانصاحب یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کی شخصیت سے مرعوب ہو کر اتنے بہت سے آدمی ان کو اسٹیشن تک پہنچانے کے لئے جا رہے ہیں۔ راستہ میں جو شخص بھی ملتا خانصاحب اس کو ایک خاص انداز کے ساتھ سلام کرتے اور ساتھ ہی ایک آدھ جملہ بھی ارشاد فرماتے۔

قاضی جی! بھئی! ہمارے گھر کی خیر خبر رکھنا، تم ہی لوگوں کے اوپر گھر چھوڑ کر سفر کر رہا ہوں۔

میاں علیم الدین! تم سید زادے ہو، میرے لئے دعا کرو کہ خدا مجھے خیریت کے ساتھ گھر واپس لائے۔

پنڈت جی! نمائش میں ضلع کے حکام بھی آتے ہیں، تمہارے مقدمہ میں ڈپٹی صاحب سے سفارش کروں گا۔ گھبرانا نہیں، بس ذرا میرے

علیگڈھ پہنچنے کی دیر ہے پھر تو یہ حاکم لوگ اپنی مٹھی میں ہیں۔

بجا فرمایا! زمانہ خراب ہے۔ میرے پیچھے گاؤں میں کوئی جھگڑا نہ ہو جائے آج کل کے نوجوان مفت کی لڑائی مول لیتے پھرتے ہیں۔

مہتاب خاں! ہمارے کھیتوں کی بچاؤ رکھوالی کرتے رہنا یہ ہمارے گاؤں کے قصائیوں اور گڈریوں کی بکریاں اگر کھیت میں پہنچ گئیں تو فصل کو تباہ کر دیں گی۔

گاؤں کے نکڑ پر گاؤں کے مکھیا کی چوپال تھی۔ بہت سے لوگ چوپال پہ بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔ خانصاحب کو دیکھ کر مکھیا نے آواز دی کہ خانصاحب ابھی تو ریل گاڑی کے چھوٹنے میں دیر ہے، دو چار کش لگاتے جائیے۔ خانصاحب یہ سنکر چوپال پہ پہنچے مکھیا نے خانصاحب کے سامنے حقہ پیش کیا اور خانصاحب نے دو چار کشوں میں دھواں اڑا دیے۔

تمہارے خانصاحب اس عمر میں بھی ماشاءاللہ! کتنے چھیلے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک شخص نے قدرے مسکرا کر کہا۔

یا تو خانصاحب اسٹیشن پہنچنے کے لئے جلدی کر رہے تھے اور اب اپنے حسن و جمال کی تعریف سننے کے بعد چارپائی پر جم کر بیٹھ گئے اور فرمانے لگے:-

ارے! تم تو میرے سامنے پیدا ہوئے ہو، تم نے میری جوانی کہاں دیکھی ہے۔ ان (مکھیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) سے پوچھیے میری جوانی کا حال، پورے ضلع میں مجھ سے زیادہ خوبصورت اور دیدارو

جوان ایک بھی نہ تھا، اب تو بھیا اڈھلی ہوئی جوانی ہے۔

یار لوگوں نے خانصاحب کی باتوں سے لطف اٹھانے کے لئے، بات میں بات نکالنی شروع کی، اور خانصاحب نے بڑھ بڑھ کر جواب دیئے۔ میں نے جیسے تیسے خانصاحب کو اٹھایا، اسٹیشن مکھیا کی چوپال سے تھوڑی دور تھا۔ چند منٹ میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ ہم جیسے ہی اسٹیشن پر پہنچے لائن کلیر کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے خانصاحب سے کہا کہ آپ سامان کو دیکھتے رہیئے میں ٹکٹ لینے جاتا ہوں، خانصاحب نے ازار بند میں روپے خوب کس کر باندھ لئے تھے اب گھبراہٹ میں ازار بند کی گرہ نہ کھلتی تھی خانصاحب پسینہ پسینہ ہو رہے تھے اور اب ہاتھوں کی بجائے دانتوں کی باری آگئی تھی، بڑی مشکل سے جیسے تیسے ازار بند کی گرہ کھلی، خانصاحب نے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے ایک روپیہ ہمارے حوالہ کیا۔ اور بیسیوں گالیاں اپنے گھر والوں کو سنا ڈالیں۔

میں نے اس خیال سے کہ خانصاحب اوّل جلول آدمی ہیں، ریل کا ٹکٹ ممکن ہے کہ گھبراہٹ میں کہیں کا کہیں رکھ دیں، خانصاحب کا اور اپنا ٹکٹ اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ جب میں بکنگ آفس سے واپس ہوا تو خانصاحب نے ٹکٹ کا تقاضا کیا، میں نے کہا کہ آپ کا ٹکٹ میرے پاس ہے، آپ گھبرائیں نہیں، اطمینان رکھیں اس پر خانصاحب نے فرمایا کہ:-

میاں منظور! میرا ٹکٹ میرے حوالے کیجئے، میں اپنا ٹکٹ اپنے قبضہ میں کئے بغیر ریل گاڑی پر قدم بھی نہ رکھوں گا۔ مجھے تمہارا ہر طرح اطمینان

ہے، مگر بھائی! ریل کے سفر کا معاملہ ہے خدا سی دیر میں کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔

میں نے دیکھا کہ خانصاحب کسی طرح مانتے ہی نہیں اور اُن کی کٹ حجتی کا انداز بتدریج تیز ہوتا جا رہا ہے تو میں نے اُن کا ٹکٹ اُن کے حوالے کر دیا۔ خانصاحب نے اپنے ٹرنک کو کھولا اور شیروانی کی جیب میں ٹکٹ کو رکھ دیا۔ گاڑی کی آمد آمد کی خبر پاکر بہت سے گنوار مسافر بہت دیر پہلے تیار ہو کر کھڑے ہو گئے خانصاحب نے بھی ان لوگوں کا ساتھ دیا، اور مجھے نصیحت فرمانے لگے:۔

اس اسٹیشن پر گاڑی بہت کم دیر ٹھہرتی ہے، بھائی! بیٹھنے میں جلدی کرنا اور اپنا اسباب اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا۔ ریل کے چور بڑے دیدہ دلیر اور ہوشیار ہوتے ہیں خدا نگاہ چوکی۔ اور مال دوستوں کا! اور ہاں بھیا پہلے مجھے گاڑی میں بٹھا دینا۔ اس کے بعد تم بیٹھنا۔ اور دیکھو ایک مرتبہ اسباب کو گن لو، دونوں کے سات عدد ہیں۔

تھوڑی دیر میں گاڑی آگئی، میں اور خانصاحب ایک ڈبہ پر پہنچے، جو مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ مسافروں نے ہمیں دیکھتے ہی چلّانا شروع کیا۔

یہاں بالکل جگہ نہیں ہے اور ڈبہ میں جائیے، انجن کے پاس کے ڈبے خالی ہیں۔

اس پر خانصاحب نے نہایت عاجزی کے ساتھ کہنا شروع کیا۔

بھیا! ہم تمہارے ڈبہ میں بیٹھیں گے نہیں، علیگڈھ تک کھڑے چلیں گے خدا کے لئے ہمیں جگہ دے دو۔ ہم کل دو آدمی ہی تو ہیں۔

مگر ریل کے مسافروں کے دل ایسی باتوں سے کب پسیجتے ہیں۔ خیر! کئی ڈبوں کے بعد ایک ڈبہ میں جگہ ملی، خانصاحب جلدی سے ڈبہ میں گھس گئے، میں نے آدمیوں سے سامان لے کر ڈبہ میں رکھا، خانصاحب پر کچھ ایسی طرح گھبراہٹ طاری تھی انہوں نے بیچ کی سیٹ کو پھلانگ کر دوسری طرف جانے کی کوشش کی، ان کا پیر پھسل گیا اور دھڑام سے گر پڑے ڈبہ کے ایک گوشہ سے آواز آئی:-

"مرغا ہے مرغا ... !"

میں نے جھپٹ کر خانصاحب کو اٹھایا اور خانصاحب نے ریل کے ڈبوں کی ساخت پر ایک امیلوریل لیکچر دے ڈالا۔ اس کے بعد کیا ہوا، خانصاحب نے کس طرح نمائش دیکھی؟

آنسو اور مسکراہٹ

کلیم ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ کلیم کے باپ تو اس کی کمسنی میں ہی داغِ یتیمی دے کر دنیا سے سدھار گئے تھے۔ ماں زندہ تھی۔ گھر میں لے دے کے کل تین آدمی تھے۔ کلیم کلیم کی ماں۔ اور تیسری کریمن ماما۔ بہت سی بیواؤں کو لوگوں نے ہنستا کھیلتا دیکھا ہے۔ غم کے بڑے بڑے ناسوروں کو زمانہ کے واقعات مندمل کر دیتے ہیں۔ مگر کلیم کی ماں کو شوہر کی موت نے زندہ درگور کر دیا۔ اس کا لٹا ہوا سہاگ اُداس ہو کر چلا گیا۔ اور اس کی ویران دنیا کو تصورات بھی آباد نہ کر سکے۔ شوہر کی موت کے وقت وہ ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ مگر صحت و تندرستی نے اُسے جوانی کے قریب کر دیا تھا۔ شوہر کے مرنے کے بعد اس کی زندگی کا سارا نظام تہ و بالا ہو گیا۔ شاداب اور حسین چہرہ ململ کے

اس کُرتے کی طرح شکن آلود ہو گیا۔ جسے دھوبی نے نچوڑ کر پتھر پر سوکھنے کے لئے پھیلا دیا ہو۔ اور اس کی سوگوار مسکراہٹ کچھ کہے بغیر غمناک دل کی ترجمانی کرتی تھی۔ غم نے حال کو مستقبل سے ملا دیا تھا۔ اور وہ دو تین برس ہی میں بوڑھی ہو گئی تھی۔ چار سال کے بعد غم نے ایک کروٹ اور بدلی بدنصیب بیوہ پر فالج کا حملہ ہوا جس نے اس کی رہی سہی قوت کو ختم کر دیا۔ وہ اس حملہ سے جانبر تو ہو گئی۔ مگر اعصاب بیکار ہو چکے تھے اور اب وہ زندگی کی اس منزل میں تھی جہاں سے قبر کا ایک قدم سے بھی کم فاصلہ رہ جاتا ہے۔

گھر کا سارا کاروبار کریمن ملا کے ہاتھ میں تھا۔ کریمن سیاہ و سفید کی مالک تھی کلیم اسکول میں پڑھتا تھا۔ گھریلو زندگی سے اسے ذرا سی بھی واقفیت نہ تھی۔ کلیم کی ماں کو فالج کے شدید حملہ نے متحرک لاش بنا دیا تھا۔ گھر کے معاملات کی کنجی کریمن کے ہاتھ میں تھی جو چاہتی کرتی اور اپنی مرضی سے گھر چلاتی۔ کلیم کو وقت پر کھانا، اچھے کپڑے اور جیب خرچ چاہیے تھا۔ سو وہ ملجاتا۔ اس لئے کریمن کی اس خودمختاری پر غور کرنے کی زحمت بھی برداشت نہیں کی۔ جوانی دور اندیش اور انجام بین بھی تو نہیں ہوتی۔

کڑاکے کے جاڑے پڑ رہے تھے۔ کلیم اسکول کی ہاکی ٹیم کے ساتھ باہر میچ کھیلنے کے لئے گیا تھا۔ اس کی ماں پر فالج کا دوسرا حملہ ہوا، اور دوسرے دن ہی وہ ختم ہو گئی حملہ ہوتے ہی وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اعصاب تن، جسم بیکار، آنکھیں بند، گردن ٹیڑھی لبوں پر مہر سکوت۔ مگر مرنے سے کچھ پہلے ہی ممتا نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے پکارا

"میرا کلیم کہاں ہے"

کلیم کو آ تار دیا گیا۔ کلیم جب وطن واپس ہوا ہے تو اس کی ماں کا جنازہ قبرستان پہنچ چکا تھا۔ جنازہ قبر میں اتارا گیا۔ کلیم نے ماں کی صورت کو آخری مرتبہ دیکھا۔ اسکی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اور بید کی ڈالی کی طرح کپکپانے لگا۔ کلیم کی آنکھوں کے سامنے اس کی ماں کو مٹی کے ڈھیر کے نیچے دفن کر دیا گیا۔

اس واقعہ کے چند مہینوں بعد کلیم نے انٹرنس کا امتحان دیا۔ اور وہ کامیاب ہوگیا قصبہ میں آگے جماعتوں کی پڑھائی کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ اور کلیم وطن چھوڑ کر باہر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اسکی تعلیم کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ کلیم نے ایک دوست کے ساجھے میں لکڑی کا کاروبار کیا مگر دونوں ساجھیوں کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے نقصان آ گیا۔ کلیم کے باپ نے تھوڑی سی زمینداری اور شہر میں کچھ جائیداد چھوڑی تھی۔ کلیم نے تجارت میں ناکامی سے متاثر ہو کر آبائی جائیداد پر ہی قناعت کرنا مناسب سمجھا۔

کلیم کی شادی کے لئے بہت سی جگہ سے پیغام آئے۔ آخر ایک جگہ بات ٹھہر گئی۔ اور میٹھی عید پر کلیم دلہن کو گھر میں لے آیا۔ کلیم کی دلہن فریدہ متوسط خوشحال گھرانے کی لڑکی تھی۔ آنکھ ناک کی درست۔ خوش سلیقہ، حیا فطرت، نیک سیرت متین، سنجیدہ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وفا اور خودداری کا پیکر۔ دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا اسمیں بے پناہ جذبہ تھا۔ اس کی نیکی کا یہ واقعہ سارے قصبہ میں مشہور رہا تھا کہ ایک غریب عورت نے اس کے گھر آ کر اپنی پریشان حالی بیان کی۔ تو فریدہ نے اپنے ہاتھوں سے سنہری کڑے اتار کر عورت کو دے دیئے۔

کلیم کے گھر میں ماما کریمن سیاہ و سفید کی مالک تھی۔ اسکی مرضی کے بغیر کوئی

شخص تنکا بھی نہیں توڑ سکتا تھا۔ کلیم کریمن کی خود مختاری اور کارفرمائی کا خوگر ہو چکا تھا۔ اسے اسبات کا احساس بھی نہیں تھا۔ کہ اس کی بیوی کو بھی گھر کے کاروبار میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل ہے۔ اور تدبیر منزل کا یہ سفینہ صرف ماما اور نوکرانی کی مرضی کی پتواروں سے نہیں چل سکتا۔

فریدہ نئی دلہن تھی۔ اور ہندوستان کی نئی دلہن کو کچھ دنوں تک چھوئی موئی بن کر بیٹھنا پڑتا ہے۔۔۔ اس گڑیا کی طرح، جو اپنی مرضی سے آنچل بھی نہیں سمیٹ سکتی۔۔۔ فریدہ خاموشی کے ساتھ سب کچھ دیکھتی رہی، وہ محسوس کر رہی تھی کہ ماما کریمن کی خود مختار حیثیت گھریلو زندگی کے لئے زیادہ مفید نہیں ہے۔ اس نے ایک آدھ مرتبہ دبی زبان سے کلیم پر اس کا اظہار بھی کیا۔ مگر کلیم نے بیوی کے کہنے کی ذرا بھی پرواہ نہ کی۔ بلکہ دو ایک مرتبہ فریدہ کو یہ بات جتا دی کہ کریمن کے لئے اس کی مرحومہ ماں نے وصیت کی تھی کہ اسے میری جگہ سمجھنا۔ کریمن کو کوئی تکلیف پہنچی تو میں حشر میں دامنگیر ہونگی۔

فریدہ نے گھر کے سودا سلف کا پتہ لگایا تو معلوم ہوا کہ کریمن پیسہ کی چیز کے چار پیسے وصول کرتی ہے اور اوپر سے اُلٹا احسان جتاتی ہے کہ میں اس گھر کے لئے خاک ہوئی جاتی ہوں اور انتہائی کفایت سے کام کیا جاتا ہے۔

ایک دن کریمن کلیم سے سودے سلف کے لئے روپے لے رہی تھی زمینداری کا روپیہ جو کریمن کے پاس رکھا تھا ختم ہو گیا تھا۔ فریدہ بھی وہیں پلنگ پر بیٹھی ہوئی چھالیہ کاٹ رہی تھی۔

تو کریمن تمہارے پاس ایک پیسہ بھی نہیں رہا۔۔۔ کلیم نے کہا۔

میاں تمہارے سر کی قسم میرے پاس ایک پیسہ زہر کھانے کو نہیں، میں تم سے کوئی چھپا کر رکھ سکتی تھی کل چار آنے رہ گئے تھے۔ سو اس کا میتھی کا ساگ آ گیا۔۔۔ کریمن نے جواب دیا۔

کلیمؔ دو دو پیسے کر باہر چلا گیا۔۔۔ فریدہ نے بہت کچھ ضبط کرنے کی کوشش کی۔ اور کئی مرتبہ دل کی بات زبان پر آ کر رہ گئی۔ مگر آخر کار اس سے رہا گیا۔ اپنے گھر کو لٹتا دیکھ کر کون ضبط کر سکتا ہے۔

کریمن! چار آنے کا ساگ آیا تھا۔۔۔ فریدہ نے کہا۔

چار آنے کا نہیں تو کیا دھیلے کا آیا تھا۔۔۔ کریمن پیشانی پہ بل ڈالتے ہوئی بولی۔

تو کیا یہاں تمہارے شہر میں میتھی کا ساگ سونے کے مول بکتا ہے۔ فریدہ نے جواب دیا۔

سونے کے مول تو نہیں بکتا، دو آنے سیر کا بھاؤ ہے آج کل! کریمن نے ٹھنک کر کہا۔

گھر میں کل تین آدمی ہیں تو ایک وقت میں کیا دو سیر ساگ پک گیا، جبکہ ساگ کے علاوہ دال اور گوشت کی دو ہانڈیاں بھی پکی تھیں۔ فریدہ بولی۔

دلہن! آپ کیا مجھے چور سمجھتی ہیں۔ آج تک گھر میں کسی نے ایک حرف بھی مجھے نہیں کہا۔ ہزاروں روپیہ کا لین دین میرے ہی ہاتھوں پر ہوتا ہے۔ آپ کی مرنے والی ساس نے تو اپنے گہنے کے صندوقچہ کی کنجی بھی مجھے سونپ دی تھی۔ وہ آج گر ہوتیں تو کوئی مجھے کچھ کہہ سکتا تھا۔

کریمن نے یہ کہتے ہوئے رونا شروع کیا آنکھوں سے موٹے موٹے مگر بناوٹی آنسو گرنے لگے۔ اس نے اپنے چہرے پر "ناکردہ گناہی" کے بہت سے آثار پیدا کر لئے تھے۔ مگر فریدہ "دل کے چور" کو اچھی طرح دیکھ رہی تھی، سیرت کی برائی، بناوٹ کے پردے میں مشکل ہی سے چھپتی ہے۔ فریدہ نے جتنی ٹوہ لگائی اتنی ہی بڑھیا کریمن کی مکاری اور چوری بے نقاب ہوتی گئی۔ فریدہ نے کریمن کو ٹوکنا شروع کیا اور بہت سی چیزوں میں کریمن کی چوری پکڑ کر دکھا دی، کریمن اپنی خود مختاری میں کسی دخل اور احتساب کو گوارا نہ کر سکتی تھی۔ فریدہ کا وجود اس کے "جلب منفعت" کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہو رہا تھا۔

کریمن جہاندیدہ اور ہوشیار تھی۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا کہ کلیم اور فریدہ کے اختلاف اور میاں بیوی کے بگاڑ ہی سے اس کی گاڑی چل سکتی ہے۔ اس نے کلیم کے کان بھرنا شروع کر دیئے۔ ذرا ذرا سی بات کو نمک مرچ لگا کر بیان کرتی۔ اور ایک کی چار جوڑتی۔ ایک مرتبہ کریمن اور فریدہ باتیں کر رہے تھے باتوں باتوں میں موسم کا ذکر آ گیا۔ فریدہ نے کہا۔

تمہارے قصبہ میں تو سدا خاک ہی اُڑتی رہتی ہے۔ کیا یہاں سے ریگستان قریب ہے۔ میں تو کپڑے جھاڑتے جھاڑتے تھک جاتی ہوں۔

اتفاق کی بات کلیم بھی باہر سے آ گیا۔ اس نے بیوی کی باتوں کو سنا اور دوسرے دن تنہائی میں کریمن سے پوچھا کہ

"دلہن کل کیا ذکر کر رہی تھی"

کرین تو موقع کی منتظر تھی ۔ اس نے کہا ۔

میاں ! یہ آپ کی دلہن تو کسی کو خاطر میں نہیں لاتیں ۔ ان کی باتیں سنتے سنتے میرے تو کان پک گئے ۔ ذرا ذرا سی بات میں اپنے باپ کے گھر کی بڑائی جتاتی ہیں ۔ کبھی کہتی ہیں ۔ اس گھر میں آکر میری تو قسمت پھوٹ گئی ۔ کبھی کہتی ہیں میں کسی بڑے گھر کے قابل تھی ۔ کبھی فرماتی ہیں کہ اس گھر میں میرا جی نہیں لگتا ۔ یہاں کے درو دیوار مجھے کاٹے کھاتے ہیں ! اور میاں ایک دن تو تمہارے متعلق ۔ ۔ ۔ ۔ !

کرین کہتے کہتے رک گئی ۔ جیسے کوئی جس طرح ایک کے خوف اور دوسرے کی بات چھپانے کے خیال سے کسی کی کہی ہوئی بات نہ کہہ سکے یا کہنا نہ چاہے ۔

کہو ، کہو ڈرتی کیوں ہو کرین ! مجھ سے کوئی بات تمہیں چھپانی نہیں چاہیئے ۔ ۔ ۔ کلیم نے کہا ۔

کیا کہوں میاں ! خیر ۔ ۔ ۔ ! تمہاری دلہن ایک دن مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ تمہارے کلیم میاں صفائی کا خیال نہیں رکھتے ۔ ان کے دانت کتنے پیلے رہتے ہیں ۔

کلیم ان جملوں کو سنکر بہت دیر تک خاموش بیٹھا رہا ۔ ایک خلش ، تڑپ کے ساتھ ۔ جیسی ایسی باتیں نہ تو اس کے کانوں نے کبھی سنی تھیں اور نہ وہ ایسی باتیں سننے کی توقع رکھتا تھا ۔ اچنبھے اور نفرت نے اسے پیچیدہ خیالات اور شاخ در شاخ جذبات میں گم کر دیا تھا ۔

کلیم اب فریدہ کی ہر بات کو وہ گہری نظروں سے دیکھتا تھا ۔ فریدہ بالکل بے خبر تھی اسے اس بات کا ذرا بھی پتہ نہ تھا کہ کرین اس کی روک ٹوک کا اس قدر خوفناک

انتقام لے رہی ہے۔ اور شوہر اور بیوی کے جڑے ہوئے دلوں کو من گھڑت باتوں سے جدا کیا جا رہا ہے ایک طرف بے خبری تھی۔ دوسری طرف بدگمانی اور ان دونوں کے بیچ میں مکاری۔ دغا اور شیطنت!

محلہ میں تھوڑی دور پر کسی کے یہاں زنانہ میلاد شریف تھا۔ فریدہ کو بلاوا آیا۔ کلیم مردانہ بیٹھک میں بیٹھا ہوا تھا۔ فریدہ نے غسلخانہ جاتے ہوئے کریمن سے کہا کہ میاں سے قاضی جی کے یہاں شب میں میرے جانے کے لئے پوچھ لینا۔ اُن کے یہاں آج میلاد شریف ہے۔ کلیم تھوڑی دیر بعد باہر چلا گیا۔ فریدہ غسل کر کے صحن میں آئی اور باورچیخانہ میں پہنچکر کریمن سے دریافت کیا کہ میاں نے اجازت دے دی۔

ہاں ہاں میاں نے کہہ دیا ہے کہ دلہن شوق سے جا سکتی ہیں۔ اللہ رسول کے معاملہ میں تو میری اجازت بھی ضروری نہیں۔ . . . کریمن نے توے پر روٹی ڈالتے ہوئے کہا۔

مغرب کے بعد قاضی جی کے یہاں سے ڈولی آئی۔ اور فریدہ خوشی خوشی ان کے یہاں چلی گئی۔ شب میں آٹھ بجے کے بعد کلیم مکان واپس ہوا۔ اس نے دیکھا کہ کریمن تنہا بیٹھی ہوئی گنگنا رہی ہے۔

دلہن کیا بالاخانہ پر گئی ہیں کلیم نے دریافت کیا۔

وہ تو قاضی جی کے یہاں گئی ہیں، کریمن نے جواب دیا۔

میرے بغیر پوچھے ہوئے۔ کلیم نے جھنجھلا کر کہا۔

میاں بیوی کی بات مجھے کیا معلوم! تم سے پوچھ ہی لیا ہوگا۔ ورنہ رات

میں پرائے گھر کس طرح رہتا ہیں... کرن سنجیدہ اور انجان بن کر بولی۔

قسم خدا کی مجھ سے تو ذکر تک نہیں کیا۔ کلیم نے جواب دیا۔

میاں! جب ذکر نکلا ہے، تو میں منہ پر آئی ہوئی بات کہکر ہی رہونگی۔ میرا تو پہلے دن ہی ماتھا ٹھنکا تھا کہ سسرال میں آتے ہی دوسرے دن صبح کو تین چار خط لکھ کر بھیجے گئے۔ شریفوں میں تو نئی دلہنوں کا مہینوں گھونگھٹ نہیں ٹوٹتا یہ تو پہلے ہی دن گرہستن کی طرح مکان میں گھما گھام پھرتی تھیں کرن نے جواب میں کہا۔

کلیم غصہ سے بے تاب ہو کر صحن میں ٹہلتا رہا کرن نے کھانے کے لئے کہا تو اس نے کہہ دیا کہ مجھے بھوک نہیں ہے۔

کلیم تھوڑی دیر بعد بستر پر لیٹ گیا اور انہی پیچ پیچ خیالات کی آغوش میں وہ سو گیا فریدہ دس بجے کے قریب قاضی جی کے یہاں سے واپس ہوئی۔ اور آکر سو گئی۔ صبح کو ناشتہ کے وقت کلیم اور وہ دستر خوان پر بیٹھے تو کلیم کے تیور بدلے ہوئے تھے۔

آج آپ کچھ پریشان اور متفکر سے ہیں۔ کیا خدانخواستہ طبیعت خراب ہے۔ فریدہ نے دریافت کیا۔

میں بہت اچھا ہوں، تم پراٹھے اور قیمہ کھاؤ۔ ان گہرائیوں اور باریکیوں میں جانے کی جاننے کی کیا ضرورت ہے۔

کلیم یہ کہتے ہوئے چائے کی پیالی دو تین گھونٹوں میں پی اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔ کلیم چاہتا تو رات کی بات صاف ہو سکتی تھی، مگر بدگمانی کا دماغ الجھنیں بڑھاتا رہتا ہے۔

کرمین سادہ لوح کلیم کی بدگمانی اور انگریزی کے اس مقولے سے
Strike The iron when its is hot پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتی
تھی۔ کلیم نے کئی سو روپیہ کے نوٹ فریدہ کو رکھنے کے لئے دیئے تھے۔ کرمین نے
موقع پاکر ان پر ہاتھ صاف کر دیا۔ اتفاق کی بات کہ ان ہی دنوں میں فریدہ کا چچازاد
بھائی ملازمت کی تلاش میں وہاں آیا ہوا تھا۔ کلیم نے فریدہ سے نوٹ مانگے اور
فریدہ نے صندوقچہ کھولا تو نوٹ نہ پاکر اس کا کلیجہ دھک سے ہوکر رہ گیا۔ کرمین
نے کلیم کو باور کرایا۔ کہ فریدہ اپنے میکے والوں کی امداد کرتی رہتی ہے اور گم شدہ
نوٹ وہیں بھیج دیئے گئے ہیں۔ یا فریدہ کا چچازاد بھائی فریدہ کے اشارے سے
نوٹ لے گیا۔ . . کرمین نے کلیم کو بدگمان کرنے کے لئے جھوٹ اور فریب کے بہت
سے قلعے تیار کئے تھے۔

کلیم کی قمیص جس میں طلائی بٹن لگے ہوئے تھے۔ فریدہ کے کمرے میں ٹنگی ہوئی تھی۔ کرمین
نے موقعہ پاکر سنہری بٹن غائب کر دیئے۔ کلیم نے قمیص پہنی تو بٹن غائب تھے۔ بٹنوں
کی تلاش شروع ہوئی۔ مگر چرائے ہوئے بٹن مکان میں کہاں مل سکتے تھے۔

کلیم نے بیوی سے کہا۔

"جب سے تم نے اس گھر میں قدم رکھا ہے مسلسل چیزیں چوری جا رہی ہیں۔ آخر
اس کو کیا سمجھا جائے۔ اگر چوری کی یہی رفتار رہی تو دو چار مہینوں میں گھر کا صفایا
ہو جائے گا۔"

فریدہ کی معصوم آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس کے کانوں کے

پردوں میں یہ لفظ۔ "جب سے تم نے اس گھر میں قدم رکھا ہے" نوکر ارشتوں کی طرح جا کر چبھے۔ جذبات کی شدت نے اس کے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگا دی تھی۔ وہ باوجود کوشش کے کچھ نہ کہہ سکی۔ کلیم کی بدگمان نگاہ میں فریدہ کی آنکھ کا ہر آنسو مگرمچھ کا بناوٹی آنسو ( ) تھا۔ ایک طرف آنسو بہہ رہے تھے دوسری طرف غصہ سے چہرہ تمتا رہا تھا۔

فریدہ! میں اب ضبط نہیں کر سکتا۔ بہتر یہ ہے کہ تم کچھ دنوں کے لئے اپنے باپ کے گھر چلی جاؤ اسی میں بھلائی ہے، یہ میرا آسان اور نرم ترین فیصلہ ہے شرافت اور انسانیت کا بھی یہی تقاضا ہے۔

فریدہ کو دوسرے ہی دن میکے روانہ ہونا پڑا۔ بادلِ ناخواستہ شوہر کو ناراض کر کے کوئی شریف عورت میکے جانا پسند نہیں کرتی۔ فریدہ اس سے پہلے بھی کلیم سے جدا ہوئی تھی۔ مگر یہ جدائی جگر خراش جدائی تھی۔ بلکہ روح فرسا۔ کلیم اس سے پہلے جدا ہوتے وقت فریدہ کو محبت کی نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا۔ مگر اب کی مرتبہ وہ فریدہ کو جاتے دیکھ کر تسکین سی محسوس کر رہا تھا جیسے ایک بوجھ سا اس کے سر سے اتر رہا ہے۔ محبت کی نگاہ عتاب و بدگمانی سے بدل چکی تھی۔

فریدہ میکے پہنچی، اضطراب و پریشانی کی دنیا لئے ہوئے۔ وہ کسی سے اپنا غم بیان بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ غم کی آتشِ خاموش میں جلی جا رہی تھی۔ میکے کا کوئی آدمی اس آگ کو بجھا بھی تو نہیں سکتا تھا۔ فریدہ نے باپ کے یہاں پہنچ کر کلیم کو لمبا چوڑا خط لکھا، خط کی بہت سی سطریں آنسوؤں میں بھیگ کر پھیل گئی تھیں۔ کلیم نے

اس کے جواب میں لکھا۔

میں جب تک تمہیں خود نہ بلاؤں۔ اسوقت تک یہاں آنے کا ارادہ نہ کرنا۔

فریدہ نے پھول بھیجے تھے۔ مگر جواب میں پتھر ملے۔ اس کے دل پر جو کچھ بیتی ہو گی۔ افسانہ نگار کا بے جان قلم اس کی ترجمانی کرنے سے قاصر ہے۔

کرین کے لئے میدان صاف ہو گیا تھا۔ وہ اب بے روک ٹوک گھر چلا رہی تھی (یعنی برباد کر رہی تھی) فریدہ کے چلے جانے کے بعد بھی کرین کے دل کا بخار نہ نکلا۔ وہ برابر اس بے گناہ کی طرف سے لگاتی بجھاتی رہی۔ کلیم کے دل میں فریدہ کے لئے برائے نام گنجائش رہی تھی۔ اور یہ برائے نام گنجائش بھی "شوہر اور بیوی کے تعلق" کا پرتو تھی۔ کلیم نوجوان تھا۔ گھر میں بے فکری تھی۔ دوستوں نے دوسری شادی کے لئے ابھارا۔ اور دوست نہ بھی ابھارتے تو بھی وہ از خود سلسلہ جنبانی کرتا۔

ایک جگہ بات قرار پا گئی۔ کلیم اب اس الجھن میں تھا کہ "دوسری شادی کرنے سے پہلے وہ فریدہ سے بالکل قطع تعلق کر لے یا یہ تعلق بھی باقی رہے فریدہ میکے میں رہے گی۔ اس کے مصارف کے لئے وہ تھوڑا بہت روپیہ وہیں بھیجا کرے گا۔ دوسری بیوی اس کے پاس رہے گی۔" انہیں خیالات میں وہ آج کل الجھا ہوا تھا۔ ایسی اہم نزاکتوں اور ذمہ داریوں کا فیصلہ بہت مشکل ہے۔ کلیم بھی کسی معقول فیصلہ پر نہ پہنچ سکا۔

ایک دن کلیم دوستوں کے ساتھ پکنک کے لئے گیا۔ دریا کی ریت میں پہلے تو سب دوستوں نے کبڈی کھیلی۔ اس کے بعد تیراکی کا مظاہرہ ہوا تیرنے کے بعد

سب نے کپڑے پہننے شروع کئے۔ کلیم کے پاس ہی ایک دوست قمیص پہن رہا تھا۔ کلیم کی نظر بٹنوں پر پڑی۔

یہ بٹن تمہارے ہیں؟ ... کلیم نے کہا۔

ہاں! میرے ہی ہیں، تم سمجھتے ہو میں کہیں سے چرا لایا ہوں ... دوست نے ہنس کر جواب دیا۔

یہ بٹن تم نے کہاں سے لئے تھے کیا؟ ... کلیم نے دریافت کیا۔

نہیں! میں نے مول لئے تھے ... دوست نے جواب دیا۔

شہر واپس آکر دریافت پر معلوم ہوا، کہ کرمین کے بھائی نے ان بٹنوں کو فروخت کیا تھا۔ کرمین سے دریافت کیا تو وہ مرغوں کی بنی ہوئی کانوں پر ہاتھ دھرنے لگی۔ خفیہ پولیس کا تھانہ دار کلیم کا دوست تھا۔ کلیم نے جا کر اس واقعہ کی اطلاع دی۔ تھانیدار نے کرمین کے بھائی کو بلوا کر دریافت کیا تو وہ مکر گیا کہ میں نے بٹن نہیں بیچے۔ تھانے دار نے ہتھکڑیاں لگائیں اور کرمین کے بھائی کی گوشمالی کی۔ اس پر اس نے اقرار کر لیا کہ کرمین نے یہ بٹن اس کو بیچنے کے لئے دیئے تھے۔ تھوڑی سی چھان بین کے بعد معلوم ہوا کہ نوٹ بھی کرمین ہی لے پرائے تھے۔ بہت سی باتوں کے سراغ لگتے گئے۔

کلیم نے سب سے پہلے اپنی ہونے والی دوسری سسرال کو تار دیا۔

"میں شادی کرنا نہیں چاہتا۔ ہاتھ چیت کو منسوخ اور کالعدم سمجھا جائے۔"

اور تار دیتے ہی پہلی ٹرین سے سسرال روانہ ہو گیا۔ وہ شب میں اپنی سسرال پہنچا۔ اور میاں بیوی کا تنہائی میں جب آمنا سامنا ہوا، تو کلیم نے بیوی کے پیروں کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

"میرے گناہ کو معاف کر دو! تم مظلوم ہو فریدہ! میں ظالم ہوں۔"

فریدہ کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی!

ایکھ کے کھیت میں

دیہاتی افسانہ

ساجھے کی ہانڈی سدا چوراہے پر پھوٹتی ہے، سمجھے بھرانی! میں کیا کہہ رہا ہوں؟ بنواری رسی بٹتے ہوئے بولا۔

— بھیا بنواری! اس سنسار میں مل جل کر کام کرنا کیا پاپ ہے۔ لوگ لاکھوں کا بیوپار ساجھے میں کرتے ہیں۔ میں بھی پنڈتا جی کی کھیتی میں ساجھی ہو گیا تو کون سی برائی ہو گئی؟ بھرانی نے چلم کا کش لگاتے ہوئے جواب دیا۔

— تو نے بڑے بوڑھوں سے وہ مثل تو سنی ہو گی کہ گھوڑے کے نعل ٹھکتے دیکھ کر ایک مینڈکی نعل بند سے بولی کہ میرے بھی نعل ٹھونک دے۔ نعل بند نے مینڈکی کے پیٹھ پر

لعل رکھ کر جو ہتھوڑی ماری۔ تو اس کا کچومر نکل گیا۔ تو بھیا! آدمی کو اپنی حد میں رہنا چاہیئے۔ پنڈا جی بڑے آدمی ہیں۔ تیرا اور ان کا کیا ساتھ۔ تجھے ساجھا ہی کرنا تھا تو گاؤں میں بہت سے کسان اور تجھ جیسے جھٹ بھیا مل سکتے تھے۔ دو تین دن ہوئے سکھی سنگھ جاٹ کا بڑا بیٹا مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میرا ایک بیل مر گیا ہے۔ کوئی ساجھی مل جائے تو بیلوں کی جوڑی سے بیساکھ کی فصل کے لئے کھیتوں میں جتائی شروع کر دیں۔" بنواری نے کہا۔

"تیرا یہ تو کہنا ٹھیک ہے کہ پنڈا جی پربت ہیں۔ اور میں کنکری ہوں۔ میرا ان کا کیا جوڑ؟ مگر آئی ہوئی لچھمی کو ٹھکرانا بھی تو اچھا نہیں ہے۔ پنڈا جی نے اپنی حویلی میں بلا کر مجھ سے ساجھے کے لئے کہا۔ اور جب سے میں ان کا ساجھی ہوا ہوں میرے حال پر ان کی بڑی مہربانی ہے۔ اب کی برسات میں میرا گھر گر گیا تھا۔ پنڈا جی نے اسے بنوا دیا۔ وقت بے وقت وہ میری مدد بھی کرتے رہتے ہیں۔ میرے سالے کی دسہرہ پر سگائی آئی تھی۔ سو روپیہ کی ضرورت آن پڑی۔ میرے کہنے پر پنڈا جی نے بنا بیاج کے روپیہ ادھار دے دیا۔ جب سے ان کی کھیتی میں میرا ساجھا ہوا ہے میرے تو دلدر دور ہو گئے۔ پنڈا جی مجھے بہت چاہتے ہیں۔" بھوانی نے جواب دیا۔

"غریبی اور امیری میں سدا کا بیر ہے۔ آگ، پانی، شیر اور بکری کی طرح! دھن دولت والوں کے ساتھ رہ کر نباہنا سانپ کو کھلانا ہے۔ یہ لوگ کان کے کچے اور دل کے کھوٹے ہوتے ہیں۔ ان کی مہربانی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اور میں تو رہ رہ کر یہ سوچتا ہوں کہ پنڈا جی گاؤں کے دوسرے آدمیوں کو چھوڑ کر تجھے اتنا کیوں چاہتے ہیں۔ مجھے

اس میں کوئی بھید معلوم ہوتا ہے۔ پنڈا جی کے بہت سے رشتہ دار ایک ایک کوڑی کو محتاج ہیں اور پرائی مزدوری کر کے جیسے تیسے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ اُن کے حال پر پنڈا جی کو ترس کیوں نہیں آتا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنا۔ بنواری نے انگوچھے سے مونچھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

بنواری تو بڑا ہی وہمی ہے۔ پنڈا جی کی مہربانی میں تجھے کوئی گہرا بھید دکھائی دیتا ہے۔ کھیتی میں روپیہ تو پنڈا جی نے لگایا ہے۔ میری تو ہاتھ پاؤں کی محنت ہے۔ ٹوٹا آ گیا تو میرا کیا جائے گا۔ بہت کریں گے پنڈا جی مجھے اپنا ساجھی نہیں رکھیں گے۔ میں اپنے گھر خوش وہ اپنے گھر خوش۔

مجھے تو اس ساجھے میں لالچ ہی لالچ نظر آتا ہے۔ بنواری! ایشور نے چاہا تو دو سال کے بعد میرے کھونٹے پر دو بھینسیں اور چار بیل بندھے ہوئے دیکھنا! جبرانی نے قدرے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

بنواری نے دو ایک لفظ ہی میرے منہ سے نکالے تھے کہ بندر نچانے والا ڈگڈگی بجاتا ہوا گلی کے نکڑ پر آ گیا جہاں بنواری اور جبرانی بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

ڈگڈگی کی آواز کا ہے کو تھی تار برقی تھی گاؤں کے اس سرے سے اس سرے تک خبر پھیل گئی اور ذرا سی دیر میں بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ننگ دھڑنگ بچوں کی گلیوں میں لین ڈوری لگی ہوئی تھی جو اس قدر شوق اور تیزی سے بھاگے چلے آ رہے تھے، جیسے ڈگڈگی والا مٹھائی بانٹ رہا ہے۔ تماشائیوں میں سب سے زیادہ تعداد عورتوں کی تھی۔ گاؤں کی بہوئیں گھونگھٹوں کی آڑ سے تماشا دیکھ

رہی تھیں۔ اور کنواری لڑکیاں بے حجابانہ شریک نظارہ تھیں موٹے کھدر کے لال پیلے لہنگے جن پر آدھ آدھ بالشت کی گوٹ لگی ہوئی تھی۔ قناد یز کی چولیاں اور ٹول کے کرتے اور اوڑھنیاں ہاتھوں میں کانچ کی ہری ہری چوڑیاں، پیروں میں پیتل کے بچھوے۔ کانوں میں بالے اور جھمکے اور بعض کے ماتھوں پر جھومر بھی ہل رہے تھے بڑھاپا، جوانی اور بچپن کا پُر لطف سنگم! بوڑھی عورتوں کے چہروں کی جھریاں مسکراہٹ کے سبب اور زیادہ سکڑ گئی تھیں۔ جوان اور بیاہی عورتیں خوب کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں۔ بعض کے رخساروں میں ہنسی نے گڑھے ڈال دیئے تھے۔ کمسن لڑکیاں ہنسنے کے ساتھ ساتھ اچھلتی بھی تھیں۔ اتنی معصوم مسرتوں کے مناظر بہت ہی کم دیکھنے میں آتے ہیں۔

گاؤں والے شہریوں کی طرح آوارہ نگاہ نہیں ہوتے۔ جو شام کو پارکوں اور باغیچوں میں صرف آنکھوں کے چٹخاروں کے لئے جاتے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ اس تماشے میں بہت سی کنواری لڑکیاں اس طرح کھڑی ہوئی تھیں کہ ان کے سینوں سے اوڑھنیاں ڈھلک کر نیچے آگری تھیں اور جوانی و تندرستی کے آثار گریباں بھی تھے اور نمایاں بھی۔ پاکبازی اور سادہ دلی کی انتہا ہے کہ ایک آنکھ بھی اس طرف نہیں اٹھ رہی تھی۔ شہروں میں ایسے مناظر ہوتے تو نہ جانے کتنے لونڈے:۔ پلٹ تیرا دھیان کدھر ہے کہتے ہوئے داغ اور امیر کے اشعار گنگنا کر آنکھوں کی پیاس بجھاتے۔ گاؤں والوں کے سینوں میں بھی دل اور دل میں جذبات ہوتے ہیں۔ ان کے جذبات کی انگیٹھی چنگاریوں سے خالی نہیں ہوتی۔ مگر ان کی سادہ اور مصروف زندگی ہوسناک چٹخاروں کے لئے

ان کو مہلت ہی نہیں دیتی۔ ہوس اور عشقبازی کا وہ جذبہ جو ناولوں، افسانوں، تصویروں
غزلوں اور سینما کے مناظر کے آغوش میں پنپتا اور بڑھتا ہے اس سے گاؤں والے اور عورتیں
اور نا آشنا ہوتے ہیں۔ یہی چیز ان کی فطرت سادہ کے دامن کو نمناک اور شکن آلود
نہیں ہونے دیتی۔

بندر نچانے والے نے بندریا کی گردن میں بندھی ہوئی ڈوری کو دھمکی دی اور
بندریا بندر کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئی۔ اس کے بعد بندر والا بولا۔

"ارے! اتنی کیوں خفا ہے اپنے خصم کی خطا معاف کر دے۔"

بھولی بھالی عورتیں مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ کچھ شرما گئیں۔ اس ایک فقرے
نے ان کی گھریلو زندگی کے بہت سے واقعات یاد دلا دیئے۔

ان عورتوں میں جوان لڑکی چنبیلی بھی کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی۔ چنبیلی گاؤں
کی سب سے زیادہ خوبصورت لڑکی تھی۔ ناک نقشہ میں تو گاؤں کی دوسری لڑکیاں بھی
اس کی ٹکر کی تھیں۔ مگر اس کا کھلتا ہوا رنگ اپنی نظیر آپ تھا۔ گاؤں کے کرخت ماحول
میں اتنی دلکش صباحت کا پایا جانا حیرت انگیز تھا۔ چنبیلی چھپر کے ستون سے ٹیک
لگائے کھڑی تھی ترشے ہوئے بت کی طرح۔

دوسری لڑکیوں کی طرح وہ کھلکھلا کر نہ ہنستی تھی۔ تبسم زیر لبی، یا زیادہ سے زیادہ
خندہ نما تبسم! سنجیدہ حسن اور زیادہ قیامت آفریں ہوتا ہے اس کا ایک انداز تھا
کہ قالب شعر کے سانچے میں ڈھلنے کے لئے بیتاب تھا بلکہ دعوت دے رہا تھا۔
گاؤں میں نہ کوئی افسانہ نگار تھا نہ کوئی شاعر، یا وہ خودرو پھولوں کے پودے کی طرح

آپ ہی آپ لہرا رہی تھی - اس کی وہ نگاہیں جو دھرتی کی چھاتی دھڑکا سکتی تھیں - بندر اور بندریا پر شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑ رہی تھیں - نوشتی ناوک فگن . . . . . اناڑی بندوقچی . . . . قوت کا بے محل استعمال!

تماشہ ختم ہوا اور اس مردِ قلندر نے اپنی چادر ناہموار زمین پر پھیلا دی جس پر تھوڑی سی دیر میں مختلف قسم کے اناج کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں نظر آنے لگیں . . . . . ڈراپ سین — تماشہ ختم — بندر والا اناج کی جھولی کاندھے پر لٹکا کر بندروں کو لیکر چلا گیا - جہاں ہنگامہ تھا وہاں خاموشی طاری ہو گئی، شاید ڈگڈگی نے جو چہل پہل پیدا کی تھی وہ اس کے ساتھ ہی چلی گئی — دنیا کی مسرت کتنی گریز پا ہوتی ہے - پانی کے بلبلے کی طرح ابھرا اور ٹوٹ گیا -

زمانہ مسرتوں کا گہوارہ بھی ہے اور قبر بھی

(۲)

پہلی ہی فصل میں بھوانی کے وارے نیارے ہو گئے - بسیا کھ میں خوب پیدا ہوئی اور بھوانی اناج کی گٹھڑیاں اپنے گھر لے گیا - بھوانی پر ساہوکار کا تھوڑا بہت قرض تھا وہ بھی بنٹ گیا - پنڈت جی نے دودھ کی ایک بھینس بھی اس کو دے دی تھی - بھوانی کی چاندی ہی چاندی تھی - گیہوں کی روٹی، دودھ کی کھیر، خوب بہت سے گھی سے بگھاری ہوئی دال گاؤں والے کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے! اب اس کا شمار گاؤں کے کھاتے پیتے لوگوں میں تھا - دنیا بنئے کی ساکھی ہے - اس لوبھی سنسار میں پیسہ اور مایا کی پوجا ہوتی ہے خالی ہاتھ کو کوئی ٹھکراتا بھی نہیں - بھوانی نے چھ مہینہ دنیا کی رامائن پنچ کا منتظر

دیکھ لیا۔ وہ لوگ جو کل تک اس سے بچتے ہوئے کتراتے تھے۔ آج اس سے ملنے کے موقع تلاش کر رہے تھے۔ بنواری اور اس کے دوسرے جن دو چار دوستوں نے بھوانی کو ڈرایا تھا کہ پنڈا جی کی کھیتی میں ساجھی ہونا اچھا نہیں۔ ان کی نصیحت پر بھوانی کی خوشحالی ہنستی تھی اور اسے یقین تھا کہ جلاپا اور حسد کی وجہ سے ان لوگوں نے ایسا شورہ لیا تھا۔ بھوانی کے خیالات کا فیصلہ حق بجانب بلکہ مبنی برحق تھا۔ کھیتی کی اس شراکت نے اس کی قسمت کے تاریک تارے کو یکایک جگمگا دیا۔ پھر پنڈا جی نے ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا جو بھوانی کو برا لگا ہو۔ بھوانی خوش تھا اور بہت زیادہ خوش تھا۔

اک ذرا سی امید پر یہ حال!
آدمی کی خوشی کو کیا کہئے

وہ اپنے مستقبل کا خاکہ جی ہی جی میں مرتب کر رہا تھا کہ چار پانچ سال تک اگر ساجھا نبھ گیا تو گاؤں میں پنڈا جی کے بعد اسی کا نمبر ہوگا۔

بھوانی کی لڑکی چنبیلی جوان ہو چکی تھی۔ جوان بیٹی کے بیاہ کی فکر ایسی ہے جیسے چھاتی پر پہاڑ رکھا ہو۔ جب تک وہ ٹل نہ جائے چین نہیں ملتا۔ بھوانی بھی اپنی سیانی بیٹی کو جلد سے جلد دلہن بنانا چاہتا تھا۔ گاؤں کے حجام بر کی تلاش میں ادھر ادھر گشت لگا رہے تھے۔ بیاہ میں سب سے بڑی رکاوٹ روپیہ پیسہ کی تھی۔ اب اس کی بھی زیادہ فکر نہ رہی تھی۔ بھوانی کا خیال نہیں بلکہ یقین تھا کہ ضرورت پڑے گی تو پنڈا جی سو دو سو کے لئے انکار نہیں کریں گے۔ چنبیلی کی ایک خوشحال گھرانے سے بات چیت آئی اور بات قریب قریب طے ہو گئی۔ پنڈا جی کو بھوانی اپنا انتہائی ہمدرد محسن اور اچھے برے کا ساتھی

سمجھتا تھا۔ اس رشتہ کی پنڈاجی کو اطلاع دینی بھی ضروری تھی، جاڑے کی رات تھی، ایک دن صبح سویرے بھوانی پنڈاجی کے یہاں پہنچا۔ پنڈاجی لحاف اوڑھے حقہ پی رہے تھے۔

"پالاگن مہاراج" بھوانی نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"سکھی رہو اتخت پر بیٹھو، نیچے کیوں بیٹھتے ہو، پنڈاجی نے روئی کے کنٹوپ کی گھنڈی کاج سے نکالتے ہوئے جواب دیا۔

بھوانی تخت پر بیٹھ گیا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔

"پنڈاجی! تمہاری چنبیلی کے بیاہ کی بات پکی ہو گئی ہے اسی کا ذکر کرنے کے لئے میں یہاں آیا ہوں" بھوانی نے پنڈاجی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کس کا؟ چنبیلی کا بیاہ! ابھی سے! ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟" پنڈاجی کسی شدید تاثیر اور جذبہ کو چھپاتے ہوئے بولے!

"پنڈاجی! آپ مجھ سے زیادہ بدھ مان ہیں۔ مجھے تو آپ کے سامنے زبان کھولتے ہوئے لاج آتی ہے۔ زمانہ خراب ہے، سیانی بیٹی کا گھر میں بٹھانا اچھا نہیں۔ چنبیلی کی عمر تو بہت تھوڑی ہے۔ مگر آپ اس کے اٹھان کو دیکھ رہے ہیں۔ ککڑی کی طرح بڑھوار ہے اس کی۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اس کا بیاہ کل ہوتا ہو! آج ہو جائے مجھے بس یہی ایک چنتا ہے۔ اب کے پورن ماسی پر لڑکی کے ہاتھ پیلے کرنے کا ارادہ ہے، بھوانی نے تحمت کے قالین کے ڈورے میں گرہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

"اس کی منگائی کہاں سے آئی ہے؟ تم مجھ سے آج اسبات کا ذکر کر رہے ہو" پنڈاجی کروٹ بدل کر بولے۔

۔۔خان پور کے نواب صاحب کی زمینداری میں نگر کوٹ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے وہاں کے ساہوکار پریم راج کے بیٹے کے لئے بیاہ کی بات چیت چل رہی ہے۔ پریم راج لین دین کرنے کے علاوہ کھیتی بھی کرتے ہیں۔ چار ہل کی کھیتی ہے ان کے وہی ایک لڑکا ہے ان کا چنبیلی پر جی سکھی رہے گی۔ لڑکا تحصیلی اسکول کے چار درجہ تک پڑھا ہوا ہے اسے کانجی ہاؤس کی محرری ملتی تھی۔ مگر باپ نے کہہ دیا کہ ہمارے گھر میں کس بات کا توڑا ہے ہمارا لڑکا نوکری نہیں کرتا" جھرانی نے کہا۔

تم بڑے نادان ہو جھرانی! اچھا بیٹی کے بیاہ کے معاملہ میں جلدی نہیں کرنا چاہیئے، چنبیلی کے بیاہ کی فکر تم سے زیادہ مجھے ہے۔ چنبیلی تو گاؤں کے نہیں شہر کے قابل ہے گاؤں میں بیاہ کر کے تم اس کی قسمت نہ پھوڑو۔ پریم راج تو کیا اس کی جڑ بنیاد سے میں واقف ہوں۔ اس کا باپ حشمت گنج کے بھاڑ کے سامنے چنے بیچا کرتا تھا۔ سب لوگ اسے تجوری کہہ کر پکارتے تھے۔ پریم راج ایسا کہاں کا مالدار ہے جو تمہاری بیٹی اس کے یہاں راج کرے گی۔ اس کے پاس زیادہ سے زیادہ ہزار دو ہزار کی پونجی پنجیا ہوگی۔

جھرانی تم جلدی نہ کرو میں تمہاری بیٹی کا ایسا رشتہ تلاش کروں گا کہ سدا کو عمر رانی بنکر رہے گی۔ بیاہ میں تھوڑی بہت مدد بھی کروں گا۔ پنڈت جی نے جواب دیا۔

پنڈت جی آپ کا بڑا احسان اور پرورشی ہے کہ میرے بنا کہے ہی آپ کو میری چھوری کی فکر ہے مگر میں پریم راج کو زبان دے چکا ہوں میں اپنی بات سے پھر دوں گا تو دنیا کیا کہے گی؟ جھرانی قدرے متوحش ہو کر بولا۔

۔۔دنیا کیا کہتی۔ تمہاری بیٹی ہے۔ تم کو اختیار ہے۔ تم آج ہی گاؤں کے

نائی کو بھیجکر کہلوادو کہ میری بیٹی کی ایک اور جگہ بات چیت ہو رہی ہے، یہ رشتہ میرے رشتہ داروں کو پسند نہیں ہے اور میں رشتہ داروں کو ناراض کرکے بیاہ کرنا نہیں چاہتا۔"

پنڈاجی نے ذرا سخت لہجہ میں جواب دیا۔

"میں آپ کے حکم کو ٹال نہیں سکتا پنڈاجی! آپ کے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔ آپ کے کہنے سے میں باہر نہیں ہو سکتا۔ چاہے ساری دنیا مجھ سے چھوٹ جائے۔"

بھوانی نے کہا۔

"تم سے مجھکو ایسی ہی امید تھی! میں بھی تمہاری بیٹی کے بر کی تلاش میں رہوں گا۔ اور تمہارے یہاں کہیں سے کوئی بات چیت کرنے کو آئے تو تم مجھ سے مشورہ کر لینا۔"

پنڈاجی نے یہ الفاظ کہتے ہوئے نوکر کو آواز دی۔ نوکر دوڑا ہوا آیا۔ پنڈاجی نے اشارہ کیا اور نوکر نے مٹھائی کی ٹوکری، بھوانی کے سامنے تخت پر رکھدی۔

"گھر جاتے وقت مٹھائی لیتے جانا عظیم پور کے ٹھاکر جے سنگھ کے پوتے کا دشٹون تھا وہاں سے مٹھائی کے تین پروسے آئے تھے۔ آدھی مٹھائی میں نے تمہارے لیے ٹوکری میں علیحدہ رکھوا دی ہے۔" پنڈاجی نے حقہ کا خوب لمبا کش لگاتے ہوئے کہا۔ اور بھوانی مٹھائی کی ٹوکری لے کر گھر چلا آیا۔

(۳)

برسات کی رت ہے بادل برس کر کھل چکے ہیں۔ نہایت ہی خوشگوار موسم ہے۔ جنگل میں چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آتی ہے۔ کھیتوں کی پگڈنڈیوں کے پیچ و خم برسات کے پانی میں ڈوب کر چلنے والوں کو مشکل میں ڈال رہے ہیں۔ گاؤں سے تھوڑی دور

آموں کے درختوں کے جھنڈ میں چھپ کر کے نیچے پنڈت جی اور ایک ادھیڑ عمر کا آدمی آہستہ آہستہ
باتیں کر رہے ہیں۔ اُن کی بھنچی ہوئی آواز اور دبا ہوا لہجہ کسی خوفناک سازش کا پتہ دے رہا تھا۔
"پنڈت جی! میں نے دو ایک مرتبہ بھوانی کو ٹوکا تھا، کہ دیکھو وہ کتنے پانی میں ہے
مگر وہ تو غیرت اور غصہ کا جوالا مکھی نکلا۔ اپنی بیٹی کا نام سنتے ہی اس کی آنکھوں سے چنگاریاں
نکلنے لگیں۔ میری تو پھر اس سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑی۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بڑے سے
بڑا لالچ بھی اس کو رام نہیں کر سکتا"۔ ادھیڑ عمر کے آدمی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔
"کرم چند! یہ کام تو تجھے کرنا ہی پڑے گا۔ تجھے خبر ہے کہ میں نے چنبیلی کے لئے
ہی بھوانی کو کھیتی میں ساجھی کر کے پنا گو سو روپیہ کا نقصان کیا ہے۔ مجھے تو ہر وقت
چنبیلی کا دھیان رہتا ہے۔ میں جلد سے جلد اسے اپنی گود میں دیکھنا چاہتا ہوں۔
کل وہ نہا دھو کر اپنے باپ کے ساتھ حویلی میں آئی تھی۔ سچ جاننا! میں تو سے تاکتا ہی رہا
تھا۔ جوانی کس پر نہیں آتی۔ مگر چنبیلی جیسی جوانی نہ دیکھی نہ سنی۔ اپنے زمانہ کی وہ شکنتلا
ہے شکنتلا! کرم چند! میں تو اس کے پریم کی اگنی میں پھر اجا رہا ہوں۔ تو کوئی تدبیر نکال
جو تو مانگے گا دوں گا"۔ پنڈت جی نے جواب دیا۔
"میری سمجھ میں تو صرف ایک ہی بات آتی ہے وہ یہ کہ آپ بھوانی کو کلکٹر کی
کچہری میں کوئی کام نکال کر بھیج دیں۔ بھوانی کے چلے جانے کے بعد میدان خالی ہو جائیگا
اسوقت کوئی نہ کوئی تدبیر نکالی جائیگی۔ پنڈت جی آپ کے لئے زمین و آسمان ایک کر دونگا
چاہے مجھے اپنی جان کی بازی کیوں نہ لگانی پڑے"۔ اور "کرم چند پوری بات بھی نہ
کہنے پایا تھا کہ دو کسان لمبی لمبی ڈگیں بھرتے ہوئے باغ میں آ گئے اور ان دونوں کی باتوں

کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

پنڈاجی کی زمینداری اور ساہوکارے کا ایک نہ ایک مقدمہ ضلع میں رہتا ہی تھا۔ ایک مقدمہ میں وکیل کو مختتانہ دینا تھا اور ضروری کاغذات بھجوانے تھے۔ جس کے لئے بھوانی کو تیار کیا گیا۔ بھوانی نے کہا کہ میں کچہری دربار کی باتیں کیا جانوں، کسی جاننے والے کو بھیج دیجئے۔ مگر دیرینہ ہوس اور سوچی ہوئی سازش کے سامنے ان دلیلوں کو کون سنتا تھا۔ بھوانی ضلع کے لئے روانہ ہوا۔ چنیلی پر باپ کی حبدائی کا اثر تھا، اور باپ بھی بیٹی کے اس اثر کو محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اسے بہر حال جانا تھا۔ پنڈاجی اس کے مہربان شریک اسے آمادہ کر چکے تھے۔ اس غریب کو کیا خبر تھی کہ اس کی معصوم بچی کو ہوسناکی کے جال میں پھانسنے کے لئے یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے۔ بھوانی آدمی غیور تھا اگر اسے اس کا وہم بھی ہوتا کہ پنڈاجی کے دل میں بدی ہے تو وہ لاکھوں کی دولت میں آگ لگا دیتا۔ وہ سازش سے بالکل بے خبر تھا۔

پنڈاجی کے اطوار ہمیشہ سے خراب تھے۔ اُن کی ہوسناکی قناعت پسند نہ تھی۔ اُن کی گھریلو زندگی انتہائی سیاہ اور اُن کا کردار نفرت انگیز تھا۔ اُن کی جوان لڑکی سرسوتی باپ کو دیکھتی تھی جوان لڑکی۔ کھانے پینے کی بے فکری۔ خوشحالی گھر کا ماحول معصیت آلود آخر جذبات کی بارود کب تک گرم نہ ہوتی۔ باپ جب گھر کی نوکرانیوں کو گھور کر دیکھتا تو وہ پدر بزرگوار کی ہوسناک نگاہوں کو اچھی طرح پہچانتی تھی۔ اس نے باپ کے کمرے سے بارہا عورتوں کو ایک خاص انداز میں نکلتے دیکھا۔ پنڈاجی گاؤں والوں کی نظروں سے چھپا کر پاپ کرتے تھے۔ مگر ان کی بیٹی پر ہر بات روشن تھی۔ اس معصیت گاہ میں اس

لڑکی کی پرورش ہو رہی تھی۔ جس کے جذبات کی حرارت اوپر کے سطور پر محفوظ تھی۔ پنڈت جی سمجھتے تھے کہ بچی نادان ہے کچھ سمجھے گی نہیں۔ حالانکہ جوانی اندھی ہونے کے باوجود ایسی باتوں کو سات پردوں میں دیکھ لیتی ہے۔

پنڈتا جی کے گھر میں بوڑھا کمہار کام کاج کرتا تھا۔ اس کے جوان لڑکے سے سرسوتی کو دلچسپی ہو گئی۔ کمہار کا لڑکا ڈرتا تھا۔ غریبی اور امارت کے امتیاز نے تبادلۂ جذبات کے درمیان سنگین دیوار کھڑی کر دی تھی مگر نگاہیں برابر منزلیں طے کر رہی تھیں۔ اور آنکھوں کے پیام سلام کے سہارے دونوں ایک دوسرے سے قریب ہوتے جا رہے تھے۔

(۴)

بھوانی کو ضلع گئے ہوئے تین روز ہو گئے تھے۔ پنڈت جی اور کرم چند نے مل کر آخری اسکیم تیار کی۔ اتفاق کی بات کہ بھوانی کی بیوی کا پاس ہی کے گاؤں میں کسی رشتہ دار کے یہاں جانا نکل آیا۔ کنواری لڑکیوں کو موت کے گھروں میں لے جانا بدشگونی سمجھا جاتا ہے۔ چنبیلی کی ماں بچی کو مکان پر چھوڑ گئی۔ کرم چند نے بھوانی کے گھر آ کر چنبیلی سے کہا کہ پٹواری کھیتوں کی پڑتال کے لئے آ رہا ہے۔ بھوانی چونکہ پنڈت جی کے کھیتوں میں ساجھی ہیں۔ ان کا موقع پر ہونا ضروری تھا۔ جب وہ نہیں ہیں تو تیرا وہاں رہنا ضروری ہے۔ نہیں تو بھوانی کا نقصان ہو جائے گا۔ ایکھ کے کھیت پر آنے کے لئے چنبیلی کو آمادہ کیا گیا۔ اس فریب کے ساتھ۔

سرسوتی اور کمہار کا لڑکا بھی تنہائی چاہتے تھے۔ پنڈتا جی کی حویلی میں ہر وقت چہل پہل رہتی تھی۔ غریب کمہار کا ناتجربہ کار لڑکا خطرے میں کودنے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ مگر

جذبات کو اپنے لئے بہر حال راستہ نکالنا تھا۔ وہی وقت اور وہی دن دونوں نے ایکھ کے کھیت پر آنے کا مقرر کیا جس وقت چنبیلی کو ایکھ پر بلانے کے لئے اسکیم تیار کی گئی تھی یہ بالکل اتفاقی توارد تھا۔

پنڈاجی آج بہت مگن تھے وہ مقررہ وقت سے بہت پہلے ایکھ کے کھیت پر پہنچ گئے وہ آپ ہی آپ نشہ میں جھوم رہے تھے۔ تخیل ہوسناکی کی محفل سجا چکا تھا۔ چنبیلی وقت پر گھر سے چلی مگر راستہ میں اسکی سہیلیاں مل گئیں ان سے بات چیت کرتے کرتے دیر ہوگئی پنڈاجی کی لڑکی وقت پر گھر سے روانہ ہوئی۔ گاؤں کے قریب ہی سے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ سرسوتی کھیتوں میں کھڑی فصل کی آڑ میں چھپتی چھپاتی آرہی تھی۔ پنڈاجی کو انتظار کی گھڑیاں بہت ناگوار تھیں۔

سرسوتی اسی ایکھ کے کھیت میں جہاں پنڈاجی چنبیلی کا انتظار کر رہے تھے کہار کے لڑکے کے انتظار میں ایکھ کے پودوں کی آڑ لے کر کھڑی ہوگئی۔ پنڈاجی بے تاب ہوکر ٹہلنے لگے وہ گردن اٹھا کر بار بار دیکھتے تھے۔ مینڈھ کے اونچے حصہ پر چڑھ کر انہوں نے نظر دوڑائی تو رنگین دوپٹہ اُن کو دکھائی دیا۔ پنڈاجی دبے پاؤں رنگین دوپٹہ والی کی طرف بڑھے لڑکی کی پیٹھ پنڈاجی کی طرف تھی۔ پنڈاجی کو یقین تھا کہ یہ بھوانی کی لڑکی چنبیلی ہے پودوں کی ڈالیوں کو آہستہ سے ہٹاتے ہوئے انہوں نے سرسوتی کو پیچھے سے جاکر آغوش میں لے لیا۔ لڑکی نے زور سے چیخ ماری، پہچانی ہوئی آواز سنکر پنڈاجی نے دیکھا تو اُن کی باہیں اس نظارہ کو دیکھ کر خود بخود ڈھیلی ہوگئیں کہ جس لڑکی کو انہوں نے ہوسناک اقدام کے ساتھ آغوش میں لیا تھا وہ اُن کی بیٹی سرسوتی تھی۔ لڑکی کی چیخیں کھیت میں کام

وں کو ہشیار کر چکی تھیں اور لوگ یہ کہتے ہوئے "سنبھالیو! ہم آگئے ہیں" دوڑے!
پنڈتا جی کا دماغ کوئی فیصلہ نہ کر سکتا تھا۔ معاملہ نازک اور انتہائی نازک تھا۔ وہ
میں ہو کر حویلی پہنچے اور وہاں سے اپنی گھوڑی پر چڑھ کر فرار ہو گئے۔ گھر گھر بلکہ
گاؤں اس واقعہ کا چرچا تھا۔ کرم چند بھی گاؤں چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔ کیونکہ وہ
تھا کہ گاؤں والوں کی غیرت بے پناہ ہوتی ہے۔ پنڈتا جی کے متعلق بہت سی خبریں
تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ انہوں نے خودکشی کر لی ہے۔ کسی کا خیال تھا کہ وہ کہیں چھپ
یاگ چلے گئے۔

چند دن بعد بھوانی بھی ضلع سے آ گیا۔ اسے گھر آ کر پنڈتا جی کے کرتوت معلوم ہوئے
نے کئی روپیہ کا پرشاد گاؤں میں بانٹا کہ ایشور نے اس کی بیٹی کی آبرو بچالی۔ وہی بیوہ
نے بھوانی کو نصیحت کی تھی جب بھوانی کے گھر آیا تو بھوانی نے اس کے پیر پکڑ کر کہا
۔ بھیا بھوانی! تو سچ کہتا تھا کہ غریبوں پر امیروں کی مہربانی کوئی نہ کوئی مطلب
بھید رکھتی ہے۔"

افضل کتب خانہ